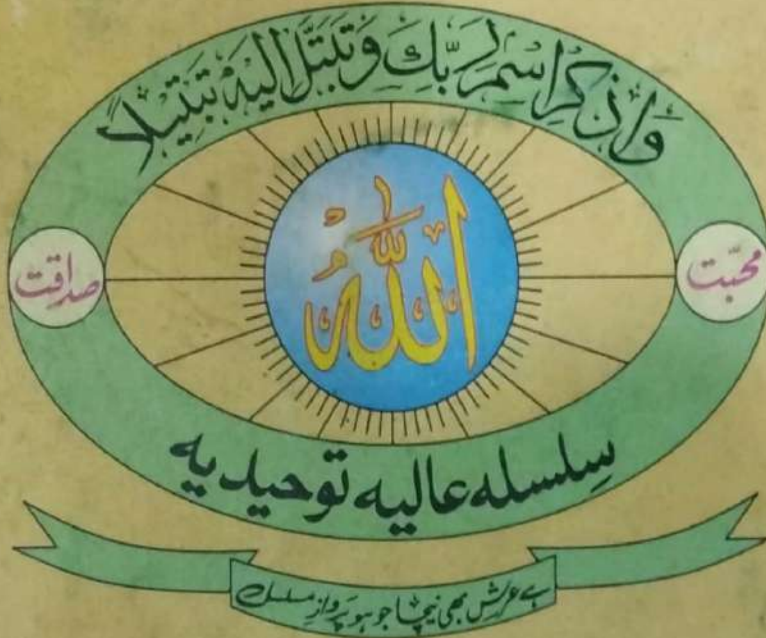
جلد 8 شمارہ 5 - اگست 2006ء رجب 1427ھ

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى ○ وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى ○ (الاعلیٰ 14-15)

بے شک وہ مراد کو پہنچ گیا جو پاک ہوا۔ اور اپنے رب کے نام کا ذکر کرتا رہا اور نماز پڑھتا رہا۔



عالمگیر محبت اور بنی نوع انسان کی اصلاح و فلاح کا علمبردار

ماہنامہ

فلاحِ آدمیت

گوجرانوالہ

Registerd

CPL No. 80

سلسلہ عالیہ توحیدیہ

مرکز تعمیر ملت جی ٹی روڈ گوجرانوالہ

بیادگار خواجہ عبدالحکیم انصاریؒ
بانی سلسلہ

نگران و سرپرست
محمد صدیق ڈار صاحب توحیدی
شیخ سلسلہ عالیہ توحیدیہ



جلد 8 شمارہ 5 اگست 2006ء رجب 1427ھ

ایڈیٹر وحید احمد

قیمت ———— -/20 روپے　　سالانہ فنڈ ———— -/200 روپے

شیخ سلسلہ سے رابطہ کیلئے:
محمد صدیق ڈار توحیدی
مرکز تعمیر ملت نزد وحید کالونی کوٹ شاہاں گوجرانوالہ
Ph:055-3862835
Mob: 0300-6493335

ایڈیٹر سے رابطہ کے لئے:
وحید احمد
تھانہ روڈ بلدیہ مارکیٹ گکھڑ ضلع گوجرانوالہ
Ph:055-3881379
Mob:0300-7409533

پبلشر عامر رشید انصاری نے معراجدین پرنٹرز مچھلی منڈی لاہور سے چھپوا کر مرکز تعمیر ملت جی ٹی روڈ گوجرانوالہ سے شائع کیا

Fax: No. +92-55-4222020
E-mail: tohidia@hotmail.com

سلسلہ عالیہ توحیدیہ

اس شمارے میں



CamScanner

درس قرآن

(ڈاکٹر ملک غلام مرتضیٰؒ)

باطل اموال اور خون خرابہ

سورۃ النساء میں ایک اور اہم موضوع کا ذکر ہے۔ جس کا تعلق باطل اموال سے ہے۔

یایھا الذین امنوا لا تاکلو اموالکم بینکم بالباطل الا ان تکون تجارۃ عن تراض منکم ولا تقتلو انفسکم o

''اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، آپس میں ایک دوسرے کا مال باطل طریقوں سے نہ کھاؤ، اگر آپس کی رضامندی سے تجارت کا لین دین ہو (اور اس سے مالی فائدہ حاصل ہو جائے تو وہ جائز ہے) اور (اس طرح) اپنے آپ کو ہلاک نہ کرو''۔ (النساء:29)

یعنی جب باہمی لین دین کیا جائے تو اِس میں فریقین کی باہمی رضامندی شامل ہونی چاہیے۔ دوسرے یہ کہ اگر آپ باطل مال کھائیں گے تو باہمی اختلافات اور جھگڑے سر اُٹھائیں گے۔ پھر فرمایا کہ اپنے آپ کو قتل نہ کرو، اِس لئے حکم دیا گیا ہے کہ ایسا ہرگز نہ کرو۔ کیونکہ اگر تم دوسرے شخص کو قتل کرنا چاہو گے تو ردِعمل کے طور پر تمہیں قتل کرے گا۔ اصل میں دوسرے کو قتل کرنا اپنے آپ کو قتل کرنے کے مترادف ہے۔ مطلب یہ ہے کہ خون خرابہ اور فساد نہ کرو۔ یہ قرآن مجید کا اسلوب ہے۔ مثلاً ایک جگہ فرمایا کہ دیکھو! اپنی بے عزتی نہ کیا کرو۔ یعنی ایک دوسرے کو برے ناموں سے یاد نہ کیا کرو۔ تم کسی دوسرے کو برے نام سے پکارو گے تو وہ جواباً تمہیں برے نام سے یاد کرے گا۔ دوسرے کو گالی دینا دراصل اپنے آپ کو گالی دینا ہے۔ حضورِ اکرم ﷺ نے ایک مرتبہ ارشاد فرمایا کہ '' بہت برا ہے وہ انسان جو اپنے والدین کو گالی دے''۔ صحابہؓ نے عرض کیا ''یارسول اللہ (ﷺ) ایسا بدبخت کون ہوگا؟'' فرمایا کہ ''جو شخص دوسرے شخص کے والدین کو گالی دے اور دوسرا پلٹ کر اس کے والدین کو گالی دے۔'' نتیجہ تو وہی ہوا کہ اُس نے اپنی حماقت سے اپنے والدین کی بے عزتی کروادی۔ بالکل اسی طرح یہاں کہا جارہا ہے کہ ''اپنے آپ کو قتل نہ کرو۔'' کیونکہ جب تم ایک شخص کو قتل کرنے کے درپے ہو گے تو وہ تمہیں قتل کرنے کے درپے ہوگا اور یوں پورا معاشرہ دہشت گردی اور بے راہ روی کا شکار ہوجائے گا۔

دُنیا۔ امتحان گاہ

پھر فرمایا:

ان تجتنبوا کبٓئر ماتنھون عنه نکفر عنکم سیاٰتکم و ندخلکم مدخلا کریماه

ولا تتمنوا مافضل اللّٰه به بعضکم علی بعض ط للرجال نصیب مما اکتسبوا ط وللنساء نصیب مما اکتسبن ط وسئلوا اللّٰه من فضله ط ان اللّٰه کان بکل شیء علیماه

''تم جن باتوں سے روکے جا رہے ہو، اگر ان (بڑے گناہوں) سے تم بچتے رہو تو ہم تم سے تمہاری (چھوٹی) برائیاں جھاڑ دیں گے اور تمہیں ایک عزت کے مقام میں داخل کریں گے۔ جس (چیز) میں اللہ نے ایک کو دوسرے پر ترجیح دی ہے، اُس کی تمنا نہ کرو۔ مردوں کو حصہ ملے گا، اُس میں سے جو اُنہوں نے کمایا اور عورتوں کو حصہ ملے گا، اُس میں سے جو انہوں نے کمایا اور اللہ سے اس کے فضل میں سے حصہ مانگو۔ بے شک اللہ ہر چیز سے باخبر ہے۔
(النساء: 31-32)''

پہلی بات تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جس کو جو چاہتا ہے، عطا کر دیتا ہے۔ بہت سی چیزیں اس نے آپ کو ایسی عطا کی ہیں جو اوروں کو نہیں دیں اور بہت سی چیزیں ایسی ہیں جو تم میں موجود نہیں اور اللہ تعالیٰ نے دوسروں کو عطا کر رکھی ہیں۔ اس کا اپنا ایک مخصوص نظام ہے۔ دنیا ایک رکاوٹی دوڑ کا سماں پیش کر رہی ہے۔ اس میں کسی کو غربت کے ذریعے اور کسی کو دولت کے ذریعے آزمایا جا رہا ہے۔ کسی کو اقتدار کو ذریعے اور کسی کو محکومی اور غلامی کے ذریعے، کسی کو ظلم کا موقع دے کر اور کسی کو مظلومی کی کیفیت سے دوچار کر کے مسلسل آزمایا جا رہا ہے۔ یہ پوری دنیا ایک امتحان گاہ اور آزمائش گاہ ہے۔ اس لئے اس بھول میں نہ رہنا کہ جو کچھ ہمیں ملا، وہ ہمیشہ کے لئے ہے یا جو کچھ کسی دوسرے کو ملا وہ بھی ہمیشہ کے لئے ہے۔ یہ محض عارضی صورتحال ہے جو محض امتحان کے لئے پیدا کی گئی ہے۔

حقوقِ نسواں

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

للرجال نصیب مما اکتسبوا ط وللنساء نصیب مما اکتسبن ط

''جو مرد کمائیں، وہ اُن کا حصہ اور جو عورتیں کمائیں، وہ اُن کا حصہ ہے۔'' (النساء:32)

ثابت ہوا کہ ایک خاتون کو کمانے کا حق حاصل ہے۔ اسلام نے اس پر پابندی نہیں لگائی۔ خاتون کو تجارت اور کاروبار کا حق ہے۔ وہ کوئی بھی جائز ذریعہ معاش اختیار کر سکتی ہے۔ ہاں ہم آگے چل کر پڑھیں گے کہ اسلام خاتون کو ان معاملات سے آزاد بھی کرتا ہے۔

مردوں کی بڑائی کی وجہ

اس کے بعد فرمایا:

الرجال قوامون علی النساء بما فضل اللہ بعضهم علی بعض وبما انفقو من اموالهم ط

''مرد عورتوں کے سرپرست ہیں بوجہ اس کے کہ اللہ نے ایک کو دوسرے پر فضیلت بخشی ہے اور بوجہ اس کے کہ اُنھوں نے اپنے مال خرچ کئے۔'' (النساء:34)

اللہ تعالیٰ نے مردوں کو خواتین پر صرف ایک درجہ کی فضیلت عطا کی ہے اور وہ فضیلت اس بات کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مردوں کو پابند بنا دیا ہے کہ وہ خواتین پر خرچ کریں۔ اللہ تعالیٰ نے خواتین کو بھی بعض معاملات میں مردوں پر فضیلت دی ہے۔ یہ صرف اسلام ہی کا اعجاز ہے، کسی اور مذہب میں اس فضیلت کا وجود نہیں ملتا۔ وہ فضیلت یہ ہے کہ بیوی گھر میں بیٹھے گی، اس کی ذمہ داری کا دائرہ کار گھر کے اندر ہے۔ عورت کو کمانے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ اس کا ولی الامر جو باپ، خاوند، بھائی، بیٹا یا قریب ترین رشتہ دار، زندگی بھر اس کی تمام ضرورتوں کا کفیل ہوگا۔ بصورت دیگر اسلامی حکومت اس کی تمام ضرورتوں کی کفیل بن جائے گی۔ ایک عورت رزق کمانے کے لئے کبھی بھی باہر نکلنے پر مجبور نہیں ہوگی۔

خاتون کی اصل ذمہ داری تربیت اولاد ہے

ہم نے بچوں کی تربیت کو شاید بہت معمولی کام سمجھ رکھا ہے۔ اس لئے ہم بچوں کو کسی آیا یا نرس کے سپرد کر کے اپنے تئیں ذمہ داریوں سے سبکدوش ہو جاتے ہیں۔ وہ قوم بہت بدنصیب ہوتی ہے جس کی ماں مر جائے یا جو قوم ماں سے محروم ہو جائے۔ قومیں ماؤں کی کوکھ سے جنم لیتی ہیں اور ماؤں کی گود میں پرورش پاتی ہیں۔ پوری قوم کا مستقبل ماں بناتی ہے۔ جدید نفسیات بھی

اس بات کو تسلیم کرتی ہے کہ انسانی شخصیت کا پچھتر فیصد حصہ اُس کی زندگی کے ابتدائی تین سالوں میں تکمیل پا جاتا ہے۔ انسان کے اندر مخصوص شخصی صلاحتیں موجود ہوتی ہیں جو اس کی ماں کی آغوش میں نشو ونما پاتی ہیں۔ اس کے بعد مسجد، سکول، کالج، معاشرہ اور دیگر عوامل مل کر اس کی شخصیت کا پچیس فیصد تعمیر کرتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ اصل مربیہ ماں ہے۔ شخصیت ماں کی گود میں ڈھلتی ہے اور پیار و محبت کی آغوش میں پلتی ہے اور یہ پیار محبت صرف ماں ہی دے سکتی ہے۔ یہ باپ کے بس کی بات نہیں۔ کبھی تجربہ کر کے دیکھئے۔ بچہ اگر بیمار ہو جائے تو تمام رات جاگتے رہنا صرف ماں ہی کا حوصلہ ہے۔ یہ فضیلت صرف ماں کو حاصل ہے، باپ کے بس کی بات نہیں۔ ماں کے مقابلے میں (صرف اس معاملے میں) باپ کی کوئی حیثیت نہیں۔ یہ ایک بہت بڑی فضیلت ہے جو اللہ تعالیٰ نے ماں کو عطا کی ہے کہ وہ بچے کے ساتھ وقت گزارے، اُسے پیار کرے، وہ ذرا بڑا ہو تو اُسے تمام رسولوں، پیغمبروں اور صالحین کی کہانیاں سنائے اور اُس کی شخصیت میں ایک سے ایک بڑھ کر اعلیٰ صفت پیدا کرتی چلی جائے، بچہ جب اُس کی گود سے نکلے تو اس کا آئیڈیل حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ایسی شخصیات ہوں۔ یہ صرف ماں کا کام ہے۔ لیکن اس کے لئے اُسے وقت کی ضرورت ہے۔ کیونکہ پرورش اور تعلیم و تربیت ہمہ وقتی کام ہے۔ جن لوگوں کی سمجھ میں اتنی سادہ سی بات بھی نہیں آتی وہ اپنے بچوں کو آیا کے سپرد کر کے چلے جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مغرب میں پروان چڑھنے والی نسل اپنے بچپن میں چونکہ ماں کی محبت سے محروم رہتی ہے، اس لئے اُس نے پوری دنیا میں دہشت گردی پھیلا رکھی ہے اور وہ پوری دنیا کو ایک چراگاہ سمجھ کے اس میں دندناتی پھرتی ہے۔ جنگ عظیم اول اور جنگ عظیم دوم کے علاوہ دیگر جنگوں کی اصل وجہ یہی تھی کہ یہ قومیں ماں کی تربیتی آغوش کے بغیر پرورش پا رہی ہیں۔ ان میں محبت اور انسانیت نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔ اسی لئے اُنہوں نے کروڑوں انسانوں کو کچل کر رکھ دیا ہے۔ حکیم الامت علامہ ڈاکٹر اقبالؒ اس ضمن میں فرماتے ہیں۔

آدمیت زار نالید از فرنگ
زندگی ہنگامہ برچید از فرنگ
یورپ از شمشیر خود بسمل فتاد
زیر گردوں رسم لادینی نہاد

گرگ اندر پوستین او برہ
ہر زمان اندر ہمین او برہ
مشکلات حضرت انساں از اوست
آدمیت را غم پنہاں از اوست
درنگاہش آدمی آب و گل است
کاروان زندگی بے منزل است

اسلام کا معجزہ۔ولی الامر کا تصور

اسلام ماں اور عورت کو یہ حق دیتا ہے کہ وہ گھر میں بیٹھی رہے اور اس کا ولی الامر اس کی تمام بنیادی ضرورتیں پوری کرے۔ ہر خاتون کا ایک ولی الامر ہوتا ہے۔ بچی پیدا ہوتی ہے تو باپ اُس کا ولی الامر قرار پاتا ہے۔ جوان ہو کر اُس کی شادی ہوتی ہے تو خاوند اُس کا ولی الامر بن جاتا ہے۔ خدانخواستہ خاوند سے علیحدگی کی صورت میں والد دوبارہ اُس کا ولی الامر ٹھہرتا ہے۔ والد وفات پا جائے تو بھائی اور اگر بھائی موجود نہیں تو بیٹا ولی الامر بن جاتا ہے، اور اگر یہ بھی موجود نہیں تو پھر قریب ترین رشتہ دار ولی الامر سمجھے جائیں گے۔ عورت عدالت میں جا کر اُس سے پورے مہینے کا نان و نفقہ طلب کر سکتی ہے اور اگر کوئی رشتہ دار بھی زندہ یا نان و نفقہ دینے کا لائق نہیں تو حکومت اس کی ولی الامر ہے۔ حکومت کے ذمہ ہے کہ وہ خاتون کو گھر بٹھا کر کھلائے۔

اسلامی تعلیمات کے مطابق ہر خاتون کو گھر بٹھا کر کھلانا پڑے گا اور ہر خاتون کو اس کا حق دینا پڑے گا۔ اس اعتبار سے اسلام ایک خاتون کو اُس کی پیدائش سے لے کر زندگی کے آخری دن تک اس بات سے آزاد کر دیتا ہے کہ وہ کہیں جا کر ملازمت یا تجارت کرے۔ یا پھر تلاش معاش میں ماری ماری پھرے۔ اس کے لئے اُسے کوئی تگ و دو کرنے کی ضرورت نہیں۔ ہاں اگر وہ از خود کوئی کام کرنا چاہے تو یہ اُس کی مرضی اور حق ہے۔

خواتین کے حقوق کے سلسلے میں تو علامہ اقبالؒ نے یہاں تک کہہ دیا:

وجود زن سے ہے تصویر کائنات میں رنگ
اُسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوز دروں
مکالمات فلاطون نہ لکھ سکی لیکن
اُسی کے شعلے سے ٹوٹا شرار افلاطوں

خاتون کی قدر ومنزلت اور احترام اللہ تعالیٰ نے ہم سب پر لازم ٹھہرایا ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''دنیا میں کوئی نبی ایسا نہیں گزرا جس نے اپنی بیوی پر کبھی ہاتھ اٹھایا ہو۔''

حالانکہ ایک موقع پر شرعی اعتبار سے سختی کی اجازت بھی دی گئی ہے۔ لیکن اُس کے لئے حدیث کا مفہوم یوں ہے کہ ''تم میں سے جو اچھے لوگ ہوں گے، وہ کبھی اپنی بیوی پر ہاتھ نہیں اٹھائیں گے۔''

اسی مقام پر عائلی زندگی کی بہتری، زوجین کے تعلقات کار، معاشرے کے مختلف طبقات کے حقوق کی ادائیگی، انفاق فی سبیل اللہ اور آخرت کی جزا وسزا کی تفصیل کے بعد دربارِ الٰہی میں حاضری کے آداب مذکور ہیں۔

نماز بحالت شعور وفہم ادا کریں

معاشرتی احکام کے بعد اللہ تعالیٰ کے دو حقوق کا ذکر کیا گیا ہے یعنی ادائیگی نماز اور توحید کا اقرار یا شرک سے بچاؤ۔ قرآن پاک میں بار بار نماز پر زور دیا گیا ہے اور اس بات کی تاکید بھی کی گئی ہے کہ نماز کو سمجھ کر پڑھا جائے۔

سورۃ النساء میں اس مقام پر اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

یایھا الذین امنوا لاتقربوا الصلوٰۃ وانتم سکاری حتی تعلموا ماتقولون o

''مومنو! جب تم نشے کی حالت میں ہو تو جب تک (ان الفاظ کو) جو منہ سے کہو، سمجھنے (نہ) لگو نماز کے پاس نہ جاؤ۔'' (النساء:43)

یہاں زیادہ زور سمجھ اور شعور پر دیا گیا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ آپ کو اس بات کا علم تو ہو کہ آپ اللہ تعالیٰ سے کیا کہہ رہے ہیں؟ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ سوچے سمجھے اور غور کو خوض کئے بغیر نماز پڑھ کے گھر چلے جاتے ہیں تو وہ نشے کی کیفیت سے مشابہ کیفیت کے حامل ٹھہریں گے۔ نماز کی بنیادی شرائط میں سے ایک یہ ہے کہ ''جو کچھ کہہ رہے ہو، وہ شعور کی حالت میں کہو۔'' اللہ جل جلالہ کی محبت میں ڈوب کے کہو۔ ایسے ہی دوسری جگہ فرمایا:

فویل للمصلین الذین ھم عن صلاتھم ساھون o (الماعون:4)

''ایسے نمازیوں کے لئے تباہی ہے، جو اپنی نمازوں کی طرف سے غافل رہتے ہیں''

شرک انتہائی ناپسندیدہ عمل ہے

شرک ایک ایسا امر ہے کہ جو اللہ بزرگ و برتر کو انتہائی ناپسند ہے۔ اللہ جل شانہ شرک کے سوا انسانوں کے تمام گناہ معاف کر دیں گے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

ان اللہ لا یغفر ان یشرک بہ

''اللہ تعالیٰ اس گناہ کو نہ بخشے گا کہ کسی کو اُس کا شریک بنایا جائے (النساء: 48)

یہ ایک اعلان کر کے اُس نے باقاعدہ کلیہ طے کر دیا کہ ہم شرک معاف نہیں کریں۔ اللہ کی ذات، صفات، حقوق اور اختیارات میں دوسروں کو شریک ٹھہرانا ناقابل معافی گناہ ہے۔

قرآن ایک سائنسی اعجاز

ایسے لوگ جو کفر کے مرتکب ٹھہرتے ہیں ان کی سزا یوں بیان کی گئی ہے:

ان الذین کفروا بایتنا سوف نصلیھم نارا ط کلما نضجت جلودھم بدلنھم جلودا غیرھا لیذوقوا العذاب

''جن لوگوں نے ہماری آیات کو ماننے سے انکار کر دیا، انہیں بالیقین ہم آگ میں جھونکیں گے اور جب اُن کے بدن کی کھال جل جائے گی تو اُس کی جگہ دوسری کھال پیدا کر دیں گے۔ تا کہ وہ (خوب) عذاب کا مزا چکھیں۔'' (النساء: 56)

یعنی عذاب کا مزا چکھانے کے لئے پھر سے کھال پیدا کر دی جائے گی۔ گویا قرآن کہہ رہا ہے کہ درد صرف کھال میں ہوتا ہے۔ یہ ایک ایسی آیت ہے جس کا مفہوم عہد حاضر میں بخوبی سمجھ میں آتا ہے۔

فرانس کے مشہور سائنسدان اور سرجن ڈاکٹر موریس بوکائے (MauriceBucaille) نے بائبل، قرآن اور سائنس کے تقابلی مطالعہ پر ایک تحقیقی کتاب لکھی ہے جس کا نام ہے ''دی بائبل، دی قرآن اینڈ سائنس'' اس کتاب نے پوری دنیا میں تہلکہ مچا دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جب میں نے یہ آیت پڑھی تو میں پھڑک اٹھا کہ قرآن مجید نے ڈیڑھ ہزار سال قبل ہی ایک ایسی بات کہی ہے جس کا ہمیں آج پتا چل رہا ہے۔ ڈاکٹر بوکائے نے کہا کہ میں سرجن ہوں اور اس ناطے سے یہ جانتا ہوں کہ جب جسم میں سوئی چبھوئی جاتی ہے تو درد صرف جلد تک رہتا ہے۔ جلد سے

آ گے نہیں جاتا۔ یعنی جسم کی کھال پورے کا پورا ایک دفاعی نظام ہے یعنی اگر ہمارے جسم میں کوئی بیرونی عنصر یا اجنبی چیز داخل ہونا چاہے تو جسم درد کے ذریعے ہمیں فوراً اطلاع کر دیتا ہے۔ قرآن یہ بات ڈیڑھ ہزار سال قبل کہہ چکا ہے کہ درد اور تکلیف صرف جلد میں ہوتا ہے۔

یہ آیت قرآن پاک کے آسمانی کتاب ہونے کی بھی دلیل ہے۔ سائنس جو حقیقت آج ڈھونڈ رہی ہے، قرآن پاک نے وہ حقیقت ڈیڑھ ہزار برس قبل ہی بیان کر دی تھی کیونکہ یہ ایک ایسی کتاب ہے جو اس کائنات کے خالق و مالک کی طرف سے نازل کی گئی ہے۔

مقام رسالت

دین اسلام میں پیغمبر اکرم ﷺ کا یہ رتبہ ہے کہ کوئی بھی شخص اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ اللہ اور اس کا رسولؐ ہر چیز سے زیادہ اُسے عزیز نہ ہو۔ یہاں بھی یہی ارشاد ہوا کہ جب تک اپنے تمام فیصلوں میں نبی اکرمؐ کے احکام کو اولیت نہ دو گے تم کبھی بھی مومن نہیں ہو سکتے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے

وما ارسلنا من رسول الا لیطاع باذن اللہ ط ولو انھم اذظلموا انفسھم جاءوك فاستغفروا اللہ واستغفرلھم الرسول لوجدو اللہ توابا رحیماہ

فلا و ربك لایومنون حتی یحکموك فیما شجر بینھم ثم لایجدو فی انفسھم حرجا مما قضیت و یسلموا تسلیماہ

''اور ہم نے جو رسول بھی بھیجا تو اسی لئے بھیجا کہ اللہ کے حکم سے اُس کی اطاعت کی جائے اور اگر وہ جبکہ انہوں نے اپنی جانوں پر ظلم ڈھایا، تمہاری خدمت میں حاضر ہوتے اور اللہ سے معافی مانگتے اور رسول بھی اُن کے لئے معافی چاہتا تو وہ خدا کو بڑا توبہ قبول کرنے والا اور مہربان پاتے۔ پس نہیں، تیرے رب کی قسم، یہ مومن نہیں ہیں جب تک اپنے باہمی اختلافات میں تمہارا حکم نہ مانیں اور جو کچھ تم فیصلہ کر دو، اُس پر اپنے دلوں میں کوئی تنگی محسوس کئے بغیر اُس کے آگے سر تسلیم خم نہ کر دیں۔'' (النساء: 64-65)

اس سے پہلے بھی یہی بات کہی گئی کہ اطاعت کرنا ہے اللہ تعالیٰ، اُس کے رسولؐ اور صاحب امر لوگوں کی کہ جو اللہ تعالیٰ کے احکامات کو اپنے آپ پر اور تم پر نافذ کرنے والے ہوں۔ اس لئے کہ جو اللہ تعالیٰ کے حکم اور اُس کی شریعت کو اپنے اوپر نافذ نہیں کرتا، وہ صحیح معنوں میں صاحب امر (ولی

الامر) نہیں بنتا۔

قیام عدل۔نزول قرآن کا مقصد

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

انا انزلنا الیک الکتب بالحق لتحکم بین الناس بما ارک اللہ ط

''(اے پیغمبر) ہم نے تم پر سچی کتاب نازل کی ہے تا کہ اللہ کی ہدایات کے مطابق لوگوں کے مقدمات کا فیصلہ کرو۔'' (النساء: 105)

اللہ تعالیٰ نے جو راہ حق دکھلائی ہے، اس میں سے ایک تو قرآن مجید ہے اور دوسری حکمت ہے جس کا قرآن پاک میں بار بار ذکر آتا ہے۔ نبی کے چار کاموں میں سے دو کام یہ ہیں کہ وہ کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔ حکمت قرآن مجید کی عملی تفسیر کا نام ہے۔ ہدایت کی دو قسمیں ہیں:

ایک نظری ہدایت ہے یعنی قرآن مجید جبکہ دوسری عملی ہدایت ہے جو رسول کی سیرت پاک ہے اور جو احادیث کی شکل میں ہمارے پاس موجود اور محفوظ ہے۔

حضور اکرمؐ کی پوری زندگی کا اتباع کرنا پڑے گا۔ جیسا کہ پہلی آیتوں میں آ چکا ہے کہ پوری زندگی میں حضور اکرمؐ کو اپنا فیصل اور حکم تسلیم کرنا پڑے گا، اور اس انداز میں کہ دل کوئی تنگی محسوس نہ کرے۔ بہت خوش دلی کے ساتھ اور سر تسلیم خم کرتے ہوئے حضور علیہ کے فیصلے کو تسلیم کرنا پڑے گا۔

مخالفت رسول کا ہولناک انجام

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

ومن یشاقق الرسول من بعد ماتبین له الهدی ویتبع غیر سبیل المومنین نوله ماتولی ونصله جهنم ط وساء ت مصیرا o

''جو شخص سیدھا راستہ معلوم ہونے کے بعد رسول کی مخالفت کرے اور مومنوں کے رستہ کے سوا راستہ پر چلے تو وہ جدھر چلتا ہے، ہم اسے اُدھر ہی چلنے دیتے ہیں اور (قیامت کے دن) جہنم میں داخل کریں گے اور وہ بری جگہ ہے'' (النساء: 115)

حضور اکرم ﷺ کی مخالفت پر کمر بستہ ہو جانا دراصل بدنصیبی کی انتہا ہے اور اس انتہا کو وہ لوگ پہنچے جو حضور اکرمؐ کے زمانے میں منافقت سے کام لیتے رہے۔ پھر فرمایا کہ ان کی بدنصیبی کا کوئی ٹھکانہ نہیں لیکن جو راستہ انہوں نے خود اختیار کر لیا ہے، اس پر ہم اُن کو آگے بڑھاتے چلے جائیں گے۔

اخلاق اور اخلاقیات

(چوہدری محمد حسین)

کسی کام کو بار بار کرنے سے اس کی انجام دہی میں آسانی پیدا ہو جاتی ہے اسے عادت کہتے ہیں۔ عادت جب پختہ ہو جاتی ہے تو اسے ملکہ کہتے ہیں جیسے کہا جاتا ہے کہ فلاں شخص کو فلاں کام میں بڑا ملکہ حاصل ہے۔ جب ملکہ راسخ ہو جاتا ہے تو اسے خلق کہتے ہیں اور خلق کی جمع اخلاق ہے۔ امام غزالیؒ جو حکمت و فلسفہ، نفسیات انسانی اور دانش ایمانی و برہانی کے سرخیل ہیں خلق کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔ **فالخلق عبادة عن هيت في النفس رسخه عنها تصدر الا فعال بسهوله و يسرمن غير حاجه الى الفكر** یعنی خلق طبیعت کی ایسی راسخ کیفیت کا نام ہے جس سے اعمال بسہولت بلا تکلف و تردد صادر ہوتے ہیں۔ اس تعریف کے مطابق خلق کا اطلاق انہی فضائل و عادات پر ہوگا جو پختہ ہوں اور جن سے متقاضی افعال کا صدور ردعمل کے طور پر فوراً ہو۔ اتفاقاً یا کسی وقتی اور عارضی جوش کے تحت صادر ہونے والے اعمال خلق کے زمرے میں نہیں آتے۔ وقتی طور پر کسی ترنگ میں آ کر محتاجوں میں مال تقسیم کرنے والے کو سخی یا وقتی جوش کے تحت دشمن کو مار گرانے والے کو شجاع نہیں کہا جائے گا۔

حکائت

کہتے ہیں کہ برصغیر میں انگریز کے دور حکومت میں ایک خاص علاقے یا قومیت کے افراد کو انکی مبینہ بزدلی کے باعث فوج میں بھرتی نہیں کرتے تھے۔ ایک دفعہ اس علاقے یا قومیت کے ایک فرد نے اصرار کیا کہ ان پر بزدلی کی تہمت جھوٹ ہے اسکی بہادری کا امتحان لیا جائے اور اس کی قوم کے افراد کے لئے بھی عسکری ملازمت کے دروازے کھولے جائیں۔ انگریز افسر نے اس کی بہادری جانچنے کے لئے اسے ایک درخت کے ساتھ کھڑا کر کے بندوق سے نشانہ باندھ کر اس کی ٹوپی میں گولی ماری جس سے اس کی ٹوپی پھٹ گئی اور زمین پر گر گئی مگر وہ شخص سیدھا کھڑا رہا۔ انگریز فوجی افسر بہت خوش ہوا اور حکم دیا کہ اس کی ٹوپی کی قیمت دی جائے اور اسے فوج میں

بھرتی کیا جائے اس پر وہ شخص بولا کہ ٹوپی کے ساتھ دھوتی کی بھی قیمت دی جائے کیونکہ۔۔۔

اخلاق اچھے بھی ہوتے ہیں اور برے بھی۔لیکن خوش خلقی ایمان کا تقاضا ہے جس طرح زمین میں بیج بویا جائے اور وقت پر پانی دیا جائے تو نتیجتاً ایک صحت مند پودے کا اگنا ایک لازمی امر ہے اسی طرح ایمان کے نتیجے میں مومن سے اخلاق حسنہ کا ظہور ضروری ہے۔لہٰذا جو مسلمان خوش خلق نہیں اسے اپنے ایمان کی فکر کرنی چاہیے۔

اخلاق کی اقسام

حکماء نے اخلاق کی دو قسمیں بتائی ہیں ایک اکتسابی اور دوسرے وہبی ،جبلی ،فطری یا طبعی۔ اکتسابی اخلاق وہ ہوتے ہیں جو ماحول معاشرے یا صحبت افراد سے اخذ کئے جاتے ہیں یا پھر تکلفاً کسی کام کے تکرار سے جیسے اوپر بیان ہوا ہے عادات پختہ ہوکر طبیعت ثانیہ بن جاتی ہیں۔تکبر، انکساری، تواضع ،غیبت ،جھوٹ، سچ، دھوکہ بازی، راست گفتاری، بدعہدی، چوری، گالم گلوچ، بدزبانی وغیرہ سب اکتسابی اخلاق کی مثالیں ہیں۔وہبی یا طبعی اخلاق وہ ہوتے ہیں جو قدرت کی طرف سے انسان کی طبیعت میں رکھ دیئے جاتے ہیں ان میں ماحول یا تربیت کا کوئی عمل دخل نہیں ہوتا جیسے طبیعت کی نرمی یا سختی۔شجاعت وسخاوت کنجوسی وغیرہ۔بعض علماء وحکما کا خیال ہے کہ اخلاق تبدیل نہیں ہوتے اور اپنے دعویٰ کی دلیل میں حضور نبی پاک ﷺ کی احادیث بیان کرتے ہیں۔ جن کا مفہوم مندرجہ ذیل ہے۔

1۔''اگر کوئی کہے کہ پہاڑ اپنی جگہ سے ہٹ گیا ہے تو مان لو اگر کوئی یہ کہے کہ فلاں شخص نے اپنی عادت چھوڑ دی ہے مت مانو''

اسی مفہوم کو پنجاب کے شیکسپیر پیر وارث شاہ صاحبؒ نے یوں بیان کیا ہے

وارث شاہ نہ عادتاں جاندیاں نی

بھاویں کٹئے پوریاں پوریاں نی

2۔''لوگ سونے اور چاندی کی کانوں کی مانند ہوتے ہیں''یعنی ان کے خصائل بدلتے ہیں

دوسرے گروہ کا نظریہ یہ ہے کہ اخلاق تبدیل ہو سکتے ہیں۔ان کی دلیل یہ ہے کہ اگر عادات واخلاق تبدیل نہیں ہو سکتے تو پھر پیغمبروں کی بعثت اور نفاذ شریعت عبث ہے مگر اللہ تعالیٰ کا کوئی بھی فعل عبث نہیں ہوتا۔مشاہدہ اور تجربہ بھی اس بات کا شاہد ہے کہ کئی برے آدمی نیکوں کی صحبت سے نیک اور نیک آدمی صحبت بد سے برے ہو جاتے ہیں۔

صحبت کے علاوہ تعلیم وتربیت بھی انسانی اخلاق وکردار پر اثر انداز ہوتی ہیں لہٰذا معلوم ہوا کہ کچھ اخلاق بدل جاتے ہیں اور کچھ نہیں بدلتے۔اب اگر بنظر غائر وتحقیق دیکھا جائے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ اکتسابی اخلاق بدل جاتے ہیں اور وہبی اخلاق نہیں بدلتے البتہ تعلیم وتربیت سے ان کا رخ نیکی کی طرف موڑا جا سکتا ہے اور انہیں قدرے معتدل کر کے فضیلت میں بدلا جا سکتا ہے مثلاً طبیعت کی سختی یا نرمی اور شقاوت یا سعادت وغیرہ۔نبی پاک ﷺ کی جو احادیث مبارکہ اوپر بیان ہوئی ہیں وہ ایسی ہی عادات واخلاق کے متعلق معلوم ہوتی ہیں۔حضرت عمرؓ کی طبیعت میں اسلام قبول کرنے سے پہلے بھی سختی تھی اور یہ عنصر اسلام قبول کرنے کے بعد بھی غالب رہا مگر صحبت وتربیت رسولؐ نے اس کا رخ صحیح سمت میں موڑ دیا۔اسلام قبول کرنے سے پہلے ننگی تلوار ہاتھ میں لیکر نبی پاک ﷺ کے قتل کے ارادہ سے نکلنا راستہ میں بہن اور بہنوئی کے اسلام کی خبر پا کر انہیں مار مار کر لہولہان کرنا طبیعت میں سختی ہی کی مثالیں ہیں۔اسی طرح حضور ﷺ کی رائے طلب کرنے پر اسیران بدر کو ان کے مسلمان رشتہ داروں کے حوالے کرنے کی رائے دینا تا کہ وہ انہیں قتل کر دیں اور اسلام کی ہیبت کفار کے دلوں پر بیٹھ جائے اور ایک منافق کو جس نے حضور کا فیصلہ قبول نہیں کیا اور دوبارہ فیصلہ کروانے کے لئے حضرت عمرؓ کے پاس گیا یہ کہہ کر قتل کر دیا کہ جسے حضور ﷺ کا فیصلہ منظور نہیں اس کا فیصلہ عمرؓ کی تلوار کرتی ہے،اسلام قبول کرنے کے بعد کی مثالیں ہیں۔اس کے برعکس حضرت ابوبکرؓ اسلام سے پہلے بھی نرم طبیعت تھے اور یہی نرمی اسلام کے بعد بھی قائم رہی۔اسی لئے بدر کے قیدیوں کے متعلق آپ نے مشورہ دیا تھا کہ انہیں فدیہ لیکر چھوڑ دیا جائے۔اسی طرح اور بھی بہت سی مثالیں تاریخ کے اوراق میں مل سکتی ہیں۔

• جس طرح اوپر بیان ہوا اخلاق اچھے بھی ہوتے ہیں اور برے بھی۔ اچھے اخلاق کو فضائل نفس اور برے اخلاق کو رذائل نفس بھی کہا جا سکتا ہے۔ انسانی طبیعت میں بہت سے فضائل و رذائل ہوتے ہیں مگر ہم یہاں صرف چار بنیادی فضائل اور ان کے مقابل بجانب افراط وتفریط آٹھ رذائل سے بحث کریں گے۔ حکماء نے جو چار بنیادی فضائل بیان کئے ہیں وہ علمیت، شجاعت، عفت اور عدالت ہیں۔ باقی جتنی بھی اخلاقی اقدار ہیں سب کی سب انہی چار فضائل کی ذیل شاخیں ہیں مثلاً ذکا، سرعت فہم، حسن تعقل، تحفظ وتذکر وغیرہ فضیلت علمیت کے ارکان ہیں۔ کبر نفس، علو ہمتی، حلم تحمل، سکون، غیرت وحمیت اور رفت جیسے فضائل فضیلت شجاعت کے ذیل میں آتے ہیں۔ حیا، حسن، ہدی، صبر وقناعت، وقار اور سخاوت وغیرہ فضیلت عفت کی فروع ہیں اسی طرح عدالت کے تحت صداقت، الفت و محبت، وفا، صلہ، رحمی شفقت، حسن، قضا، تسلیم، اور توکل جیسے اخلاق حسنہ آتے ہیں۔ ملا جلال الدین دوانی مصنف ''اخلاق جلالی'' نے ان فضائل کے علاوہ اور بھی بہت سی فضیلتیں انہی فضائل چہارگانہ کی ذیل میں لکھی ہیں۔

ہر شے یا امر کا ایک وسط ہوتا ہے جسے نقطہ اعتدال یا میانہ روی کہتے ہیں اور ہر عمل میں میانہ روی ہی پسندیدہ ہے۔ جیسا کہ عربی کا ایک مقولہ ہے **خیر الامور اوسطھا** اسی طرح ہر انسانی خصلت کا ایک وسط یا نقطہ اعتدال ہوتا ہے جو اس خصلت کی فضیلت ہوتی ہے۔ نقطہ اعتدال سے کمی بیشی فضیلت کی بجائے رذالت بن جاتی ہے دوسرے لفظوں میں افراط وتفریط کے درمیان نقطہ اعتدال ہی فضیلت ہے۔ جس طرح دو نقطوں کے درمیان سیدھا خط یعنی خط مستقیم صرف ایک ہی ہوتا ہے اور ٹیڑھے خطوط بے شمار ہوتے ہیں اسی طرح اصل فضیلت ایک خصلت کی ایک ہی ہوتی ہے جو نقطہ اعتدال پر ہو۔ اس کے مقابلے میں درجات کے لحاظ سے افراط اور تفریط دونوں جانب رذالتیں ان گنت ہو سکتی ہیں مگر یہاں صرف ایک ایک فضیلت کے مقابلے میں دو دو رذالتوں یعنی ایک بطرف افراط اور دوسری بجانب تفریط کا ذکر کیا جائے گا اس طرح مذکورہ چار فضائل یا فضیلتوں کے مقابل آٹھ رذالتیں ہونگی۔

1۔ فضیلت علمیت یا تفکر

اس کے افراط کی طرف جو رذالت ہے اسے سفہ کہتے ہیں جس کا مطلب ہے معمولی سے معمولی بات پر غیر واجب غور وفکر کرنا اور خواہ مخواہ غیر ضروری علمی نقاط پیدا کر کے بال کی کھال اتارنا یا کیڑے نکالنا۔ ایسا طرز عمل مستحسن نہیں ہے ایسے آدمی کو کریزی کہتے ہیں۔ تفریط کی جانب جو رذالت ہے اسے بلہ کہتے ہیں جس کا مطلب ہے قوت فکر کو بہ ارادہ معطل کرنا یا ضرورت کے مقام پر اس کا ترک استعمال ہے اسے جہل سے بھی تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

2۔ شجاعت

اس کے طرفین تہور اور جبن ہیں۔ تہور افراط کی جانب جس کا مطلب خواہ مخواہ خطروں میں کودنا ہے جسے عقل سلیم درست تسلیم نہ کرے۔ جبن، سمت تفریط۔ اس کا مطلب بزدلی ہے یعنی ایسی چیزوں سے خوف کھانا جن سے ڈرنا اہل دانش کے نزدیک اچھا نہیں۔

3۔ عفت

عفت میں افراط کو شرہ کہتے ہیں جس کا مطلب ہے نفس کا مقدار مستحسن سے زیادہ لذات و شہوات میں منہمک ہونا ہے اور تفریط کی طرف غمود ہے جس کا مطلب ہے ضروری لذائذ اور واجب حوائج جو کہ شرعاً اور عقلاً مستحسن ہیں کو بھی ترک کرنا۔

4۔ عدالت

عدالت کے بطرف افراط ظلم ہے اور بجانب تفریط انظلام، ظلم کا مطلب دوسروں کے حقوق غصب کرنا اور انظلام کا مطلب ہے ظلم سہنا یا ظالم کو ظلم کرنے دینا۔ بعض حکماء عدالت کے دونوں جوانب کو ظلم سے ہی تعبیر کرتے ہیں۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ ظلم برداشت کرنا بھی اپنے نفس پر ظلم کرنے کے مترادف ہے۔

اگر تھوڑا غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ عدالت ایک جامع کمال ہے کیونکہ سفہ اور بلہ میں جب عدالت کارفرما ہو کر ان میں اعتدال قائم کرتی ہے تو وہ علمیت بن جاتی ہے۔ اسی طرح تہور اور جبن

میں جب عدل قائم ہوتا ہے تو فضیلت شجاعت وجود میں آتی ہے۔علی ہذا القیاس۔مذکورہ فضائل چہارگانہ کے علاوہ بھی فضائل نفس ہیں ان میں بھی عدالت کا ہی عمل دخل ہوتا ہے۔مثال کے طور پر تواضع جو کہ اخلاقیات میں ایک نہایت ہی پسندیدہ فضیلت ہے، ذلت اور تکبر میں جب عدالت کے ذریعے تہذیب ہوتی ہے تو معرض وجود میں آتی ہے۔اسی طرح ظلم بھی عدالت کے مقابل تمام رذالتوں کا جامع ہے۔ظلم کا معنی ہے کسی چیز کو اپنی اصلی اور صحیح جگہ سے ہٹا دینا۔اب بادنی تعمق یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ہر خلق یا عادت اسی وقت رذالت بنتی ہے جب وہ اپنی اصلی حالت یعنی نقطہ اعتدال سے ہٹ کر افراط کی طرف مائل ہو تو تہور بن جاتی ہے اور جب تفریط کی طرف ہٹ جائے تو جبن یعنی بزدلی بن جاتی ہے اسی پر باقی رذائل کو قیاس کیا جاسکتا ہے لہٰذا معلوم ہوا کہ تمام رذائل میں ظلم ہی کا دخل ہے۔اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ عدالت اس لحاظ سے ام الفضائل اور ظلم ابوالرذائل ہے۔اب اگر عالم انفس و آفاق میں داخلی طور پر نفسیاتی خواہشات میں اور خارجی طور پر معاشی و معاشرتی معاملات میں عدل قائم کر دیا جائے تو ظلم ختم ہو جائے گا اور برائی کی جڑ کٹ جائے گی۔

جب ان فضائل چہارگانہ میں محبت کی شرینی مل جاتی ہے تو ایک فرزند لطیف وجود میں آتا ہے جسے حکمت کہتے ہیں اور جو تمام فضائل کا حاصل ہے جیسا کہ اللہ کریم نے فرمایا **یوتی الحکمه من یشاء ومن یوت الحکمه فقد اوتی خیرا کثیرا** (اللہ تعالیٰ حکمت دیتا ہے جسے چاہے اور جسے حکمت ملی اسے خیر کثیر ملی) اب عنان کار حکمت کے قبضہ میں ہو گی تو نتیجتاً اخلاق حسنہ کا دور دورہ ہو گا اور معاشرہ جنت نظیر بن جائے گا۔یہ دنیا (معاشرہ) چونکہ آخرت کی کھیتی ہے جب کھیتی اچھی ہو گی تو اس کا حاصل آخرت بھی اچھی ہو گی یہی مطلوب و مقصود ریاست وسیاست و رسالت علیہ صلی اللہ ﷺ ہے۔

طالب صادق کی کیفیات

تعارفی نوٹ :۔ تصوف کی راہ اختیار کرنے کے لئے اولین شرط سچی طلب ہے۔
ایسے لوگ جب سلسلہ عالیہ توحیدیہ کی انتہائی موثر اور دوں کو زندگی عطا کرنے والی تعلیم پر عمل پیرا ہوتے ہیں تو ان کی زندگی میں انقلاب آ جاتا ہے۔ بقول بانی سلسلہ قبلہ حضرت خواجہ عبدالحکیم انصاریؒ وہ ایک نیا خم لیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے قرب اور اس کی رضا کی منزل کی طرف گامزن ہو جاتے ہیں۔ خاندان توحیدیہ میں شامل ہونے والے ایک ایسے ہی خوش نصیب بھائی کا خط قارئین کی مطالعہ کے لئے پیش خدمت ہے جس میں انہوں نے اپنی قلبی حالت اور باطنی کیفیت بیان کی ہے۔

قابل صد احترام مکرمی و مرشدی!

السلام علیکم! بیعت نامہ ارسال خدمت ہے۔ عہد نامہ کی مندرجات کو ہر وقت پیش نظر رکھتا ہوں۔ میں تصوف و سلوک کے کوچہ سے واقف تھا۔ 1986ء میں سلسلہ نقشبندیہ مجددیہ کے عظیم بزرگ خواجہ محمد سعیدؒ کا مرید تھا جو 1995ء میں انتقال فرما گئے۔ میں ذکرِ قلبی اور مراقبے جوش و خروش سے کیا کرتا تھا۔ جذب کی کیفیت طاری رہتی تھی۔ لیکن سستی اور لاشعوری کی بنا پر کوئی خاطر خواہ ترقی نہ کر سکا۔

بعد ازاں ڈاکٹر اسرار صاحب کی جماعت تنظیم اسلامی ملتان میں عربی گرائمر اور تفسیر کی کلاسوں میں تا حال شرکت کرتا چلا آ رہا ہوں۔ میں بزرگ کی تلاش میں تھا سرگرداں پھرتا تھا چنانچہ 2000ء میں الخیر یونیورسٹی اسلام آباد میں دوران تعلیم (کمپیوٹر) قبلہ انصاری صاحب کی تصنیف شدہ کتب کا مطالعہ کیا تو ایسا محسوس ہوا کہ میرے سابقہ پیر صاحب کی تعلیمات کی تحریری شکل ہے۔ 2003ء نے تعمیر ملت کو مطالعہ میں رکھا۔

اب مجھے توحیدی ہونے پر تفاخر سا ہونے لگا ہے۔ باطنی طور پر اپنے آپ کو محفوظ ہاتھوں، صحیح ڈگر یعنی صراط مستقیم پر گامزن محسوس کرتا ہوں۔ راہ سلوک میں مضبوط قدم اور اثبات پیدا ہو رہا ہے

اس راہ سے ڈگمگانا یعنی واپسی مرتد ہونے کے مترادف معلوم ہوتا ہے اللہ نے اپنی معرفت میرے اندر رکھ دی ہے۔

اب میری کیفیت کچھ اس طرح ہے کہ میرے دل میں نرمی، گرمی، رقت میں اضافہ اور سوز و گداز ہے۔ باشرع داڑھی رکھ لی ہے اللہ نے منکرات اور بے حیائی کے کاموں کی طرف میلان کا زنگ نکال دیا ہے۔ دنیا سے بے ثباتی اور نیک امور میں رغبت اور آسانیاں پیدا ہو گئیں میری نفل پنجگانہ نماز (Minimum) نصاب کے علاوہ نوافل تہجد کی عادت پڑ گئی ہے۔

اصحاب صفہ کی مانند عسکری انداز میں نفس کی تربیت کا خواہاں تھا۔ جو الحمدللہ محبت صالح سے میسر آئی اور میری دیرینہ دلی تمنا ہے کہ جلد از جلد راہ سلوک کی منازل طے کروں اور واصل باللہ ہو جاؤں۔

فقط والسلام آپ کا مرید

راولپنڈی کے بھائی شمشاد احمد صاحب وفات پا گئے ہیں۔

راولپنڈی کے بھائی رمضان بٹ صاحب کے والد صاحب وفات پا گئے ہیں۔

لاہور کے بھائی محمد افضل چیمہ صاحب (ریٹائرڈ DSP) وفات پا گئے ہیں۔

تمام برادران ان کیلئے دعائے مغفرت فرمائیں

قند مکرر

رن کچھ کا معرکہ

(آفتاب احمد خاںؒ)

یہ وہ دن تھے جب حق و باطل کا معرکہ رن کچھ میں ہو رہا تھا۔ ہر زد و عام کی زبان پر تھا کہ بریگیڈیئر جنجوعہ نے رن کچھ کے میدان میں ہندوستان کی فوج کو تباہ و برباد کر دیا ہے۔ اخبارات میں یہ خبریں بھی تھیں کہ ہندوستانی افسر اپنے جوانوں کو پاکستانی فوج کے رحم و کرم پر چھوڑ کر بمبئی کے ہوٹلوں میں جا چھپے ہیں۔ ان کے مورچوں سے ان کے بریف کیس اور دیگر ذاتی سامان بھی پاکستانی فوج کے ہاتھ لگا جن کی تصاویر بھی چھپی ہوئی تھیں۔ میں اپنے دفتر میں بیٹھا آنے جانے والوں سے اور ٹیلی فون پر تازہ ترین خبروں کے لئے رابطہ رکھے ہوئے تھا۔ عین اسی دوران کوئی تین بجے بعد از دوپہر میری طبیعت میں ہیجان سا برپا ہوا اور جی چاہا کہ مجھے اس وقت قبلہ حضرت انصاری صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر ان سے اس جنگ کے بارے میں سننا چاہئے۔ میں نے اپنے کام کو جلدی جلدی سمیٹا اور کینٹ کی طرف جہاں ان دنوں حضرت صاحب کی رہائش تھی رواں دواں ہو گیا۔ راستے میں مجھے یہ خیال بھی آیا کہ اس وقت حضرت صاحب آرام فرما رہے ہونگے۔ پھر سوچا میں برآمدے میں بیٹھ کر ان کے جاگنے کا انتظار کرلونگا۔ بہر حال انہی سوچوں میں سفر جاری رہا۔ ان دنوں لاہور کی فضا میں ایک عجیب سی کیفیت تھی اور ایسا محسوس ہوتا تھا کہ آسمان سے نور برس رہا ہے اور فضا ایک خاص قسم کی خوشبو سے معطر ہے۔ پاکستان کے تمام لوگ جذبہ جہاد سے سرشار تھے اور شاید یہی امر اس خاص روحانی کیفیت کا باعث تھا۔ اسی طرح کے احساسات میں میری گاڑی لاہور کینٹ کا پل پار کر رہی تھی۔ جب میں نے چوک سے دائیں طرف گاڑی موڑی تو میں نے دیکھا کہ دور بائیں جانب درختوں کے سائے میں پگڈنڈی پر کوئی صاحب خراماں خراماں چلے آرہے ہیں۔ مجھے ایسا لگا کہ قبلہ حضرت انصاری صاحب ہیں۔ پھر خیال آیا کہ وہ اس وقت باہر اکیلے کیسے آسکتے ہیں جب کہ آپ ضعیف العمر بھی ہیں اور نظر بھی کمزور ہے۔ میں جوں جوں قریب ہوتا گیا یہ حقیقت عیاں ہوتی گئی کہ وہ حضرت صاحب ہی تھے۔ میں نے کوئی بیس گز کے فاصلے پر گاڑی روک لی۔ قبلہ صاحبؒ نے آواز دی کون ہے؟ میں نے اپنا نام بتایا تو فرمانے لگے ”تمہاری بہت ضرورت تھی اچھا کیا جو آگئے“ میں نے حیرت سے

دریافت کیا کہ جناب اس وقت سڑک پر اکیلے کیسے نکل آئے۔ مجھے فون کر دیا ہوتا میں حاضر خدمت ہو جاتا اور پھر یہ وقت تو آپ کے آرام کا ہوتا ہے۔ اس پر آپ نے فرمایا کہ حق اور باطل کا معرکہ ہو رہا ہو اور میں کیا سو رہا ہونگا۔ ساری قوم جہاد کے نشے میں جھوم رہی ہے میرا بھی جی چاہا اور لاہور کی کھلی فضا میں آ گیا ہوں۔ چلو کہیں لے چلو۔ آپ کو ساتھ لئے اب گاڑی ہارس اینڈ کیٹل شو کے میدان کے ساتھ ساتھ میاں میر والی سڑک پر چل رہی تھی۔ اردگرد میدانوں میں پاکستانی فوج سرحدوں پر جانے کی تیاریوں میں مصروف تھی۔ سڑک کے کنارے ایک بڑے درخت کے نیچے چند فوجی افسر گفتگو میں مصروف کھڑے تھے۔ قبلہ صاحبؒ نے مجھے حکم دیا کہ یہاں ان افسروں کے پاس گاڑی روکو۔ میں نے ایسا ہی کیا۔ ایک فوجی کرنل گاڑی کی طرف لپکا اور جھٹ سے دروازہ کھول کر فوجی طریقہ سے کھٹاک سے سلیوٹ کیا۔ قبلہ حضرت گاڑی سے باہر نکلے اور کرنل صاحب کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر فرمایا۔

''اپنے اسلاف کی جنگیں تو آپ کو یاد ہونگی۔ بس آج ہندوؤں پر ایک بار پھر ثابت کر دیں کہ مسلمانوں سے جنگ کرنا آسان نہیں۔ ان کو چھٹی کا دودھ یاد آ جائے۔ پوری قوم جہاد میں آپ کے ساتھ شامل ہوگی'' کرنل صاحب بولے جناب عالی! ہم آپ کو مایوس نہیں کریں گے۔ ہم سینے پر گولی کھائیں گے اور قوم کے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچائیں گے۔ اس پر قبلہ صاحب نے فرمایا ''شاباش انشاء اللہ ایسا ہی ہوگا اور فتح ہماری ہوگی'' پھر قبلہ حضرت گاڑی میں بیٹھ گئے اور کرنل صاحب نے گاڑی کا دروازہ ادب سے جھک کر بند کر دیا اور اب کی بار ان کے ساتھ ساتھ باقی تمام افسروں نے بھی بیک وقت سلیوٹ کیا جس کا قبلہ حضرت نے ہاتھ کے اشارے سے جواب دیا اور ہم آگے بڑھے۔ قبلہ حضرت آنکھیں بند کئے کچھ دیر خاموش بیٹھے رہے۔ ہونٹ آہستہ آہستہ ہل رہے تھے اور داہنے ہاتھ کی انگشت شہادت ہلا رہے تھے جیسے کوئی بات کر رہے ہوں۔ آخر کار آپ نے آنکھیں کھولیں اور فرمایا۔ ''دیکھا تم نے ان فوجی جوانوں کے چہرے کیسے دمک رہے تھے اور میدان جنگ میں جانے کیلئے کسقدر بیقرار تھے۔ ہزاروں سالوں کی عبادت سے جہاد فی سبیل اللہ کی یہ ساعت بہتر ہے۔ ماشاء اللہ کیسے پرنور چہرے دیکھے ہیں''۔ تھوڑی دیر کے بعد آپ نے پوچھا کہ یہ کونسی بستی ہے؟ میں نے عرض کیا کہ جناب ہم میاں میر صاحبؒ کے علاقے سے گذر رہے ہیں۔ آپ نے فرمایا چلو میاں میر صاحبؒ کے پاس چلتے ہیں۔ چنانچہ میں

نے مناسب جگہ پر کار روکی اور ہم مزار کے اندر چلے گئے وہاں پہلے سے بہت سے لوگ موجود تھے۔ قبلہ حضرت ایک جگہ فاتحہ پڑھنے کے لئے کھڑے ہو گئے اور میں آپ کے عین پیچھے کھڑا ہو گیا۔ پھر کچھ دیر کے بعد مجھے فرمایا چلو چلیں۔ آپ مزار سے باہر آکر ایک خوبصورت چھوٹے سے درخت کے سائے میں کھڑے ہو گئے اور میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر فرمانے لگے "پتہ ہے میاں صاحبؒ سے کیا بات چیت ہوئی" میں نے کہا نہیں حضور مجھے کیا پتہ کہ کیا بات چیت ہوئی۔ فرمانے لگے "میں نے میاں صاحبؒ سے کہا جناب حق اور باطل کا معرکہ ہو رہا ہے ذرا زور لگائیں۔ میاں صاحب نے فرمایا کہ ہمارا دور اب ختم ہو چکا ہے اب آپ زور لگائیں یہ آپ کا دور ہے" پھر آپ کھڑے کھڑے گہری سوچ میں ڈوب گئے۔ پھر مزار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ ان میں اور تمہارے اعتقاد میں بڑا فرق ہے یہ وجودی ہے۔ پھر یوں لگا جیسے کسی آواز پر متوجہ ہو کر خاموش ہو گئے ہیں اور یوں ارشاد فرمایا کہ ابھی ابھی میاں صاحب نے کہا ہے کہ انصاری صاحب مرنے کے بعد سب ایک ہو جاتے ہیں۔ میں آج کی صحبت اور حالات کے مشاہدے سے بہت حیران تھا کہ انسانی زندگی میں ایسی ایسی باتیں اور حقیقتیں بھی ہوتی ہیں۔ جب ہم گھر واپس لوٹے تو میں نے قبلہ حضرتؒ سے حضرت میاں میرؒ سے ہونے والی گفتگو دہرائی تو فرمایا کہ مجھے تو کچھ یاد نہیں اللہ ہی جانے۔ پھر فرمانے لگے بوڑھا ہوں آج بہت تھک گیا ہوں۔ چنانچہ میں نے اجازت لی اور اپنے دفتر واپس آ گیا۔ لیکن سارا دن اور پوری رات بھی انہی خیالوں میں گذر گئی اور آج مورخہ 28 فروری 1997ء میں نے اپنے دل کی بھڑاس قلم کے ذریعے اس کاغذ کے ٹکڑے پر نکال لی ہے تا کہ میرے پیر بھائی بھی جان جائیں کہ قبلہ حضرتؒ کے ساتھ میرا وقت کیسے گذرتا رہا اور جیسے میرے لئے سنہری یادیں ہے آپ بھائیوں کے لئے بھی ایسا ہی ہو جائے اور روحانی کیفیات سے مخمور ہوتے رہیں۔

(نوٹ! ہمارے بھائی آفتاب احمد خاںؒ 9 اپریل 1997ء کو اپنے خالق حقیقی سے جا ملے تھے۔ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے۔ آمین) از ایڈیٹر "فلاح آدمیت"

عربی زبان اور قرآن مجید کی تعلیم

(شیخ شوکت علی)

جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے 2 جون 2006ء کے خطبہ جمعہ کی تلخیص ''ندائے خلافت'' کے شمارہ نمبر 20 میں شائع ہوئی ہے۔ اس تلخیص کے اختتامی پیراگراف میں ڈاکٹر صاحب بیان کرتے ہیں:۔

''حاصل کلام یہ ہے کہ اگر قرآن کو اپنی آنکھ سے پڑھا جائے اور اس پر تدبر کیا جائے تو اس سے یقین قلبی حاصل ہوتا ہے۔ جس میں شدت بھی ہوتی ہے، گہرائی اور گیرائی بھی۔ قرآن پر غور و فکر کے نتیجے میں فکر قرآنی سے آگاہی حاصل ہوتی ہے اور قرآن کے فلسفہ معاشیات، سیاسیات، اور سماجیات کا شعور نصیب ہوتا ہے''۔

جناب ڈاکٹر صاحب نے اپنے اس خطبہ میں جو کچھ بیان فرمایا ہے اس کا نچوڑ یہ ہے کہ امت مسلمہ کا ہر فرد قرآن مجید کا مطالعہ کرے۔ مسلمانوں کے لئے یہ لازم ہے کہ اس عظیم کتاب کو سوچ سمجھ کر اپنی آنکھوں سے پڑھنے کے لئے اور قرآن فہمی کے لئے عربی زبان سیکھیں، تاکہ پڑھتے ہوئے قرآن ان کی سمجھ میں آتا جائے۔ قرآن کو تدبر اور غور و فکر کے ساتھ پڑھا جائے کیونکہ آج کے دور میں ضرورت شعوری ایمان کی ہے، اس شعوری ایمان کی روشنی میں جو بھی عمل کرو گے وہ وہی راستہ ہوگا، جس پر چل کر نبی اکرم ﷺ نے تئیس برس کی قلیل مدت میں تاریخ انسانی کا عظیم ترین انقلاب برپا کر دیا۔

وہ جنس نہیں ایمان جسے لے آئیں دکانِ فلسفہ سے
ڈھونڈے سے ملے گی عاقل کو، یہ قرآں کے سیپاروں میں

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے خطبہ میں لکھے گئے یہ الفاظ سونے کے حروف میں تحریر کرنے کے قابل ہیں۔ لیکن جو بات دل کو کانٹے کی طرح چبھتی رہتی ہے وہ یہ کہ اس موضوع پر ایسے الفاظ ہم صدیوں سے سن رہے ہیں، افسوس اس بات کا ہے کہ امت مسلمہ ان زریں الفاظ کے مطابق عمل نہ کر سکی۔

عربی کیسے سیکھی جائے؟ عربی کا معیار کم از کم ایسا ہو کہ اس کی مدد سے قرآن کریم کی تلاوت کرتے وقت اس کا مطلب سمجھ میں آجائے۔ اور اگر اللہ توفیق دے تو قرآنی آیات وہدایات پر غور وفکر کرنے کا شعور بھی حاصل ہو اور پھر ان کے مطابق عمل بھی ہو۔ قرآن اکیڈمی، لاہور جیسے اداروں میں قرآن مجید کی تعلیم دی جاتی ہے۔ یہ صحیح راستہ ہے لیکن 15، 16 کروڑ عوام کے لئے ناکافی ہے۔ موجودہ دور میں پاکستان کسی صورت میں مملکت جمہوریہ، اسلامیہ ہونے کے دعویٰ نہیں کرسکتا۔ ہماری سیاست، ہماری حکومت، ہماری معیشت، ہماری معاشرت، اسلامی حدود کو قبول کرنے سے گریزاں ہیں۔ حقیقت میں وہ قرآنی علم وعمل سے واقفیت ہی نہیں رکھتے۔ عوام کی اکثریت قرآنی علم وعمل اور دین اسلام کی روشنی سے محروم ہے۔ لوگ غربت اور کس مپرسی کے عذاب، ظلم وستم کے کچوکوں اور جہالت کے بھاری پتھروں تلے دبے پڑے ہیں۔ ارباب بست و کشاد مطمئن ہیں۔ ایسے ماحول میں قرآنی علم وعمل کی روشنی عوام تک کیسے پہنچائی جاسکتی ہے۔ میرے پاس تو صرف ایک ہی تجویز ہے۔ اور یہ تجویز ہر ذی شعور انسان کی زبان پر ہے۔ دو چار دن سے نہیں، صدیوں سے ہے۔ کوئی ایسی صورت پیدا کرو۔ کوئی ایسی منصوبہ بندی پر ڈٹ جاؤ کہ ملک کا ہر فرد بشر عربی کی تعلیم حاصل کر سکے۔ تاکہ ہر مسلمان کو اللہ تعالیٰ، قرآنی علم وعمل کے متعلق دی گئی ہدایات، تنبیہات اور احکام کے مطابق زندگی بسر کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

ایک قابل عمل صورت یہ ہے کہ بچوں کے نصاب تعلیم میں، دوسرے مضامین کے ساتھ ساتھ عربی مضمون کی تعلیم کو لازمی قرار دیا جائے۔

1۔ پہلی جماعت سے پانچویں جماعت تک صرف عربی گرائمر کی تعلیم دی جائے۔

2۔ چھٹی جماعت سے آٹھویں جماعت تک قرآن کریم کا کچھ حصہ کورس میں شامل کیا جائے

3۔ میٹرک تک مکمل قرآن مجید کی تعلیم کو کورس میں شامل کیا جائے۔

4۔ قرآن کریم کی تعلیم پر نمبر نہ دیے جائیں لیکن ریکارڈ کے مطابق اس بات کا جائزہ لیا جائے کہ طالب علم اس مضمون میں کامیاب ہوا ہے یا ناکام۔

5۔ جو طالب علم اس مضمون کی طرف توجہ نہ دے یا فیل ہو جائے تو اس کو اُس وقت تک

عربی کیسے سیکھی جائے؟ عربی کا معیار کم از کم ایسا ہو کہ اس کی مدد سے قرآن کریم کی تلاوت کرتے وقت اس کا مطلب سمجھ میں آجائے۔ اور اگر اللہ توفیق دے تو قرآنی آیات و ہدایات پر غور و فکر کرنے کا شعور بھی حاصل ہو اور پھر ان کے مطابق عمل بھی ہو۔ قرآن اکیڈمی، لاہور جیسے اداروں میں قرآن مجید کی تعلیم دی جاتی ہے۔ یہ صحیح راستہ ہے لیکن 15، 16 کروڑ عوام کے لئے ناکافی ہے۔ موجودہ دور میں پاکستان کسی صورت میں مملکت جمہوریہ، اسلامیہ ہونے کے دعویٰ نہیں کرسکتا۔ ہماری سیاست، ہماری حکومت، ہماری معیشت، ہماری معاشرت، اسلامی حدود کو قبول کرنے سے گریزاں ہیں۔ حقیقت میں وہ قرآنی علم وعمل سے واقفیت ہی نہیں رکھتے۔ عوام کی اکثریت قرآنی علم وعمل اور دین اسلام کی روشنی سے محروم ہے۔ لوگ غربت اور کس مپرسی کے عذاب، ظلم وستم کے کچوکوں اور جہالت کے بھاری پتھروں تلے دبے پڑے ہیں۔ ارباب بست و کشاد مطمئن ہیں۔ ایسے ماحول میں قرآنی علم وعمل کی روشنی عوام تک کیسے پہنچائی جاسکتی ہے۔ میرے پاس تو صرف ایک ہی تجویز ہے۔ اور یہ تجویز ہر ذی شعور انسان کی زبان پر ہے۔ دو چار دن سے نہیں، صدیوں سے ہے۔ کوئی ایسی صورت پیدا کرو۔ کوئی ایسی منصوبہ بندی پر ڈٹ جاؤ کہ ملک کا ہر فرد بشر عربی کی تعلیم حاصل کرسکے۔ تاکہ ہر مسلمان کو اللہ تعالیٰ، قرآنی علم وعمل کے متعلق دی گئی ہدایات، تنبیہات اور احکام کے مطابق زندگی بسر کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

ایک قابل عمل صورت یہ ہے کہ بچوں کے نصاب تعلیم میں، دوسرے مضامین کے ساتھ ساتھ عربی مضمون کی تعلیم کو لازمی قرار دیا جائے۔

1۔ پہلی جماعت سے پانچویں جماعت تک صرف عربی گرائمر کی تعلیم دی جائے۔

2۔ چھٹی جماعت سے آٹھویں جماعت تک قرآن کریم کا کچھ حصہ کورس میں شامل کیا جائے

3۔ میٹرک تک مکمل قرآن مجید کی تعلیم کو کورس میں شامل کیا جائے۔

4۔ قرآن کریم کی تعلیم پر نمبر نہ دیے جائیں لیکن ریکارڈ کے مطابق اس بات کا جائزہ لیا جائے کہ طالب علم اس مضمون میں کامیاب ہوا ہے یا ناکام۔

5۔ جو طالب علم اس مضمون کی طرف توجہ نہ دے یا فیل ہو جائے تو اس کو اُس وقت تک

میٹرک کا سٹوفکیٹ نہ دیا جائے جب تک وہ اس مضمون میں کامیاب نہ ہو جائے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بچوں کی تعلیم کے سلسلہ میں ایسی منصوبہ بندی پر عمل کرنا کیسے ممکن ہوگا۔ اس حقیقت سے تو کسی کو انکار نہیں ہوسکتا کہ موجودہ دور میں کوئی بھی حکومت، کوئی بھی محکمہ تعلیم ایسے نصاب کو رائج کرنے کے لئے تیار نہیں ہوگا۔ جس کو پاکستان بھر کے علمائے دین کی حمائت حاصل ہو۔ دوسری طرف اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ قرآن اور روح کا منبع ایک ہی ذات ہے۔ یعنی ذات باری تعالیٰ۔ قرآن بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے صادر ہوا ہے۔ اور ارواح انسانی کو بھی اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کی طرف منسوب کیا ہے۔ باری تعالیٰ کے لئے تو کسی دلیل کی ضرورت نہیں۔ اگر آپ کی روح کے اندر زندگی کی معمولی رمق بھی موجود ہے تو وہ خود بخود اس کا ادراک کرلے گی۔

ان گذارشات کے ساتھ امت مسلمہ کو اس حقیقت کی جانب متوجہ کرنا مقصود ہے کہ ہم اس وقت درحقیقت اس جرم کی پاداش میں عذاب الٰہی میں گرفتار ہیں کہ ہم دنیا میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے نمائندے ہونے کی حیثیت سے اور دین حق کے علمبردار ہونے کے مدعی ہوکر، اپنے عمل کی وجہ سے ان سب کی تکذیب کررہے ہیں۔ عذاب الٰہی سے نجات حاصل کرنے کا صرف ایک ہی راستہ ہے کہ ہم اللہ کی نمائندگی کا حق ادا کریں۔ اور اس طرح شہادت علی الناس کی اس ذمہ داری سے عہدہ براہوں۔ جس کے لئے ہمیں بحثیت امت برپا کیا گیا تھا۔

کیا اللہ کے فرمان کے مطابق عمل کرنے کا وقت، اور دین حق کو قائم کرنے کے لئے جہاد کا راستہ اختیار کرنے کا وقت آنہیں گیا؟ عمل سے گریز کی وجہ سے انحطاط زور پکڑ چکا ہے۔ چاق وچوبند رہنے کا تخیل، علمی اور سیاسی ارتقاء، تکلیف برداری، میدان جنگ، مالی اور جانی قربانی، اتحادِ عمل اور مساوات کا تخیل تمام کا تمام یکسر آنکھوں سے اوجھل ہو چکا ہے۔ خود خدائے قدوس کی اصطلاحوں کے مفہوم میں جو اس نے اپنا قانون سمجھانے کے لئے قرآن حکیم میں استعمال کیں، دردناک تصرف ہوگیا ہے۔ توحید اور شرک کے تصور کی جگہ بجائے واحدانیت اور کثرت نے لے لی ہے۔ **اعبد اللہ** کا مطلب خدا کی چاکری کی بجائے صرف زبانی اقرار رہ

گیا ہے۔صبر کا مطلب ڈٹے رہنے اور ہمت نہ ہارنے کی بجائے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھنا بن گیا۔ جنت کے حصول کے لئے میدان جنگ میں جان دینے کی بجائے صرف زبان سے اس کا تذکرہ کرنا کافی سمجھا جانے لگا، اور فساد نے جسے قرآن میں قتل سے بدتر سمجھا جاتا ہے فرقہ بندی کی صورت میں پوری ملت کو دبوچ لیا ہے۔اب بھی کچھ دردمند لوگ موجود ہیں جن کو اس دردناک زوال، اور قوم کی پس ماندگی کا احساس ہے۔وہ دنیا کے نقشے پر نظر ڈالتے ہیں تو انہیں ایک یاس انگیز خلا نظر آتا ہے۔وہ بلبلا اٹھتے ہیں، ہم کیا تھے اور کیا ہو گئے ہیں۔ان کی چیخوں میں کرب ہے، ان کی دعاؤں میں درد ہے۔ان کے کلام میں تڑپ ہے۔مگر قوم نے ان کے کلام سے بھی وہی کچھ کیا جو کہ اس نے قرآنی اصطلاحات سے کیا۔قوم کی زوال یافتہ محسوسات جو صدیوں سے عمل سے نا آشنا ہیں، صرف تحریر اور تقریر کو ہی زندگی کا زیر و بم سمجھ چکی ہیں۔صرف کلام سے کس طرح آمادہ عمل ہو سکتی ہے۔

یہ جدوجہد، یہ علمی اور عسکری طاقت، یہ بہشتِ عمل کیونکر پیدا ہو۔اس قوت کے حصول کے لئے قوم کیا کرے حکومت کیا قدم اٹھائے، جوان کیا کرے، بوڑھا کیا سامان پیدا کرے، عالم فطرت کن خزانوں پر چھاپہ مارے، عالم دین قرآن کا اصلی رنگ کیونکر پیش کرے، سادہ لوح اور بے علم کس جان گداز جرات کا سماں باندھے؟ یہ سیدھے سادھے سوال ہیں جو آج ہر پاکستانی مسلمان کی سمجھ میں آنے چاہئیں۔کیونکہ ان کے عملی جواب میں ہی قوم کی بقا کا راز مضمر ہے۔

تزکیہ نفس، اتحادِ عمل، اطاعت گذاری، خاموشی اور موت سے عشق سپاہیانہ زندگی کے وہ لوازمات ہیں جن کے بغیر سپاہی، سپاہی کہلانے کا مستحق نہیں۔فوج کا کارپورل ہو یا کمان دار ہو یا نہ ہو، اس پر آسائش سے اجتناب از روئے قرآن فرض ہے۔

اور قرآن مجید کی تعلیم کو مشکل نہ سمجھو۔اللہ تعالی کے اس فرمان کے اعادہ کو یاد رکھو:۔

''اور ہم نے قرآن کو سمجھنے کے لئے آسان کر دیا ہے۔تو کوئی ہے کہ سوچے سمجھے؟''۔(القمر)

(آخری دو پیراگراف کے الفاظ جناب سید شبیر حسین کے مضمون ''قوموں سے قوت کیسے چھن جاتی ہے'' سے لئے گئے ہیں جو مرحوم کی کتاب ''صراط مستقیم'' میں اپریل 1966ء میں شائع ہوا)

عقل بمقابلہ عشق

(عبدالرشید ساہی)

شعر نمبر 1

خرد نے مجھ کو عطاء کی نظر حکیمانہ
سکھائی عشق نے مجھ کو حدیث رندانہ

علامہ اقبال فرماتے ہیں انسان عقل اور عشق دو قوتوں کے مجموعہ کا نام ہے عقل انسان کو حکمت و دانائی عطا کرتی ہے لیکن عشق اِس میں مستی کا رنگ پیدا کرتا ہے، عقل منزل کی طرف رستہ کے سلسلے میں رہنمائی تو کرتی ہے لیکن اکثر منزل سے دور ہی ساتھ چھوڑ جاتی ہے جبکہ عشق منزل تک رسائی کا ذریعہ ہے۔

علامہ اقبال نے اپنی شاعری میں عقل کو کہیں بھی مختار کل نہیں مانا لیکن عشق کو تسلیم ضرور کیا ہے۔

عشق کی اک جست نے طے کر دیا قصہ تمام
اِس زمین و آسماں کو بیکراں سمجھا تھا میں

جس طرح واقعہ معراج شریف عشق ہی کی بدولت وقوع پذیر ہوا اِسی طرح حضرت ابراہیمؑ کا آتش نمرود میں کود جانا بھی اپنے رب کیساتھ بے انتہا عشق کی بدولت ہی ہوا اِسی طرح واقعہ کربلا بھی اور معرکہ بدر و حُنین بھی عشق کی بے مثال داستانیں ہیں۔

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق
عقل ہی محو تماشہء لب بام ابھی

عقل نے میدان زندگی کی اکثر بازیاں ہار دی ہیں لیکن عشق نے آج تک ایک بھی بازی نہیں ہاری۔ عشق مرد میدان ہے اور زندگی کی کامیابی و کامرانی کی نشانی ہے۔

شعر نمبر 2

نہ بادہ ہے نہ صراحی نہ۔ دور پیمانہ
فقط اِک نگاہ سے رنگین ہے بزم جانانہ

علامہ اقبال فرماتے ہیں عشق کی مستی کی نوعیت شراب کی مستی سے بہت مختلف ہوتی ہے۔ نگاہ مرشد کا فیض اتنی بڑی حقیقت ہے کہ میں اس کو بیان کرنے پر فخر محسوس کر رہا ہوں یہ ایک راز ہے اس راز کو فاش کرنے کیلئے یقین کامل شرط ہے علامہ فرماتے ہیں۔ ؎

یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن
قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن

نگاہ مرشد کا میں نے عملی مشاہدہ کیا ہے اور اس کی تاثیر کو محسوس کیا ہے تقریباً 30 سال کا عرصہ تلاش میں سرگرداں رہا لیکن یہ ظالم دل کہیں نہ مانا۔ دراصل یہ بڑے اعلیٰ مقدر اور بلند نصیب کی بات ہوتی ہے کہ کسی کو مومن کی سنگت نصیب ہو جائے میرے اکثر دوست مجھ سے سوال کیا کرتے تھے کہ رشید ساہی تمہیں کس قسم کے مرشد کی تلاس ہے تو میں ان کو علامہ اقبال کا یہ شعر سنا دیا کرتا۔ ؎

نگاہ مرد مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں
جو ہو ذوق یقین پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں

پھر کیا ہوا آخر بے قرار دل کو قرار آ ہی گیا مجھ پر ایک بہت ہی پیارے اور عظیم دوست مرحوم شفیق خان کی بدولت اللہ تعالیٰ کا کرم ہوا اور میری ملاقات پیر و مرشد محمد صدیق ڈار صاحب سے ہو گئی دراصل یہ کہانی سنانے کو بڑی مدت سے میں بے چین تھا مگر محض اس لئے تحریر نہیں کرتا تھا کہ بعض لوگ جن کے دلوں میں اللہ والوں کیلئے بغض اور کینہ بھرا ہوا ہوتا ہے۔ ایسی باتوں کو پیر و مرشد کی مدح میں لغو گوئی شمار کرتے ہیں دراصل دل کی بات آخر زباں پر آ ہی جاتی ہے علامہ فرماتے ہیں۔ ؎

تھا ضبط بہت مشکل اس سیلِ معانی کا
کہہ ڈالے قلندر نے اسرارِ کتاب آخر

دراصل مجھ پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے خصوصی کرم ہو رہا تھا اور مدینہ منورہ سے میری سفارش ہو رہی تھی کہ مجھے مرشد کامل مل گئے پھر کیا تھا نکلے جو میکدہ سے تو دنیا بدل گئی میری زندگی کا سارے

کا سارا معاملہ بدل گیا اور آخر ایک روز پیرو مرشد نے فرمایا ساہی دراصل وہ ہے جو ہر سانس کے ساتھ اللہ اللہ کرے۔ میری اللہ تعالیٰ سے دُعا ہے کہ میری زندگی مرشد کی محبت اور صحبت میں بسر ہو جائے میں ذاتی طور پر مرحوم شفیق خان صاحب کیلئے ساری عمر دعا گو رہوں گا اور ان کے اہل خانہ کیلئے بھی، اللہ تعالیٰ مرحوم دوست کو جنت کے بلند ترین مقام عطا فرمائیں اور ان کے اہل خانہ پر اپنی تمام تر عنایات کی تکمیل فرمائیں آمین!

موسم خوشگوار ہے موڈ بھی خوشگوار ہے یہاں آپ کو میاں محمد بخش کا ایک شعر سنا دیتا ہوں

اصلاں تے جے نیکی کریئے عُمر اں نہیں بھلاندے
بے اصلاں تے نیکی کر لئے کوڈی مل نہیں پاندے

معذرت چاہتا ہوں اپنے عنوان سے دور نکل گیا ہوں یہ ایک کیفیت تھی جو بیان کردی۔

شعر نمبر 3۔

مری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ
کہ میں ہوں محرمِ راز دورنِ میخانہ

علامہ اقبال فرماتے ہیں کہ میری شاعری دراصل میری نوائے پریشاں ہے شاعری نہیں ہے۔ دراصل میں نے تو اسلام کے حقائق و معارف شاعری کے لبادہ میں بیان کئے ہیں۔اس لئے میرے کلام کو تفریح طبع کیلئے نہ پڑھ بلکہ اس پیغام کو سمجھ جسے میں نے اشعار کی صورت میں پیش کیا ہے۔ میں نے قرآن کریم کی تفسیر پیش کی ہے، عالم اسلام کیلئے جو درد میرے دل میں تھا اس کا اظہار کیا ہے، میں نے مسلمانانِ عالم کے امراض کا علاج پیش کیا ہے، جو مصائب اور آفات امتِ مسلمہ پر آنے والی ہیں ان کے سدباب کیلئے مشورہ پیش کیا ہے، فرنگی تہذیب کو اپنانے سے جو نقصانات مجھے نظر آرہے ہیں ان سے بچنے کی تجویز پیش کی ہے۔

پسند آگئی ہے جہاں کو قلندری میری
وگرنہ شعر مرا کیا ہے؟ شاعری کیا ہے؟

دراصل علامہ اقبال نے اپنی شاعری میں حق بات بیان کی ہے یہی وجہ ہے کہ آج کے گئے

گزرے دور میں بھی اگر کسی شاعر کا کلام پڑھا جاتا ہے تو کثرت سے علامہ اقبال کا ہی پڑھا جاتا ہے۔ دراصل علامہ اقبال جس دور میں پیدا ہوئے اس دور میں عالم اسلام محکوم و مقہور رتھا حالانکہ امت مسلمہ کی تاریخ جانبازی، بہادری، عظمت اور خودداری سے مذین ہے۔

شعر نمبر 4۔

کلی کو دیکھ، کہ ہے تشنہ ، نسیم سحر
اسی میں ہے مرے دل کا تمام افسانہ

علامہ فرماتے ہیں جس طرح غنچہ کی شگفتگی قانون قدرت کے مطابق ایک خارجی شے پر منحصر ہے جسے نسیم سحر کہتے ہیں اسی طرح انسان کے دل کی روحانی ترقی اس کی ذاتی کاوش کے علاوہ اس چیز پر موقوف ہے جو خارج سے اس پر نازل ہوتی ہے یعنی فیضان الٰہی کی نعم۔ اس لئے انسان کا فرض ہے کہ وہ آخر شب میں بیدار ہو کر اللہ کے سامنے دست بدستہ کھڑا ہوتا کہ اس کا فضل و کرم نسیم صبح کے رنگ میں اس پر نازل ہو دراصل عالم مادیت اور عالم روحانیت دونوں میں ایک ہی طرح کا قانون کارفرما ہے۔ جس طرح غنچہ شبنم اور نسیم سحر کا محتاج ہی اسی طرح انسانی دل شیخ کی توجہ اور اللہ کے فضل کا محتاج ہے۔

اللہ تعالیٰ نے انسانی دل بنایا ہی ایسا ہے جو کہ مادی فراوانی سے سکون نہیں پاتا بلکہ یہ تو اللہ تعالیٰ کے ذکر سے سکون پاتا ہے اور جتنا یہ زیادہ ذکر کرتا جاتا ہے۔ اتنا ہی شگفتہ ہوتا جاتا ہے ایک روز ہمارے مرشد بھی فرما رہے تھے کہ لوہا جتنا زیادہ گرم ہوتا جاتا ہے اتنا ہی زیادہ نرم ہوتا چلا جاتا ہے پھر اسے کوٹ کر حسب منشا جس شکل میں چاہیں ڈھال لیں۔ دل میں بھی اللہ تعالیٰ کے ذکر سے گرمی اور نرمی پیدا ہوتی ہے اس وقت مجاہدہ کی ضربوں سے اسے اسوہ رسولؐ میں ڈھالنا آسان ہو جاتا ہے۔

نگاہ بلند سخن دلنواز، جاں پر سوز
یہی ہے رختِ سفر میر کارواں کیلئے

میرے مشاہدہ میں یہ بات آئی ہے کہ بعض فقیر ملنے کیلئے آنے والوں کو غلیظ قسم کی گالیاں

دیتے ہیں اور لوگوں کے خیال میں یہ بات ہوتی ہے کہ بابا جی بڑے جلالی ہیں حالانکہ جلال تو اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے ایک صفت ہے انسانوں کو زیب نہیں دیتی نبی کریمؐ کی ساری زندگی روز روشن کی طرح آپ کے سامنے ہے آپؐ نے تمام عمر جلالیت کو قریب بھی آنے نہیں دیا ساری عمر سراپا جمال اور اخلاق ہی رہے حدیث مبارکہ ہے کہ

''قیامت کے روز مومن کے نامہ اعمال میں سب سے وزنی چیز خوش خلقی ہوگی''۔

علامہ اقبال فرماتے ہیں۔

ہو حلقہ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

شعر نمبر 5۔

کوئی بتائے مجھے یہ عیاں ہے کہ حضور
سب آشنا ہیں یہاں اک میں ہوں بیگانہ

علامہ اقبال فرماتے ہیں لوگ اپنی غلط بینی کی بنا پر دوسروں کو آشنا سمجھتے ہیں حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ انسان اس دنیا میں بیگانہ ہے کیونکہ دنیا اور اس کی متعلقہ تمام اشیاء مادی ہیں اور انسان اپنی اصلیت کے لحاظ سے غیر مادی ہے اس لئے دنیا کیساتھ اس کی یگانگت پیدا نہیں ہوسکتی دنیا کی اصل مادی ہے اور انسان کی اصل روحانی ہے اس لئے انسان کا اصل یہ مکان نہیں بلکہ لامکاں ہے۔ انسان کی ضرورت صرف روٹی پانی یعنی سامان شکم ہی نہیں ہے اسے روح کی ترقی کے لئے روحانی غذا بھی درکار ہے۔

علامہ اقبال فرماتے ہیں۔

کیا میں نے اس خاکداں سے کنارا
جہاں رزق کا نام ہے آب و دانہ
یہ پورب یہ پچھم چکوروں کی دنیا
میرا نیلگوں آسماں بیکرانہ

پرندوں کی دنیا کا درویش ہوں میں

کہ شاہین بناتا نہیں آشیانہ

پلٹنا جھپٹنا جھپٹ کر پلٹنا

لہو گرم رکھنے کا ہے اک بہانہ

دنیا کی لذات میں کھو کر انسان اپنے رب سے دور ہو جاتا ہے اور بھول جاتا ہے کہ اس نے آخر اپنے رب کے پاس جانا ہے اور حساب و کتاب چکانا ہے اس کی عبرت کیلئے زمین پر قبرستانوں کی موجودگی ہی کافی ہے۔

شعر نمبر 6۔

فرنگ میں کوئی دن اور بھی ٹھہر جاؤں

میرے جنون کو سنبھالے اگر یہ ویرانہ

علامہ اقبال فرماتے ہیں یورپ میں علم و ہنر کی بہت روشنی ہے اور ہر قسم کی دلفریباں موجود ہیں لیکن میں تو جو یائے حقیقت ہوں اور ایسا رشتہ اللہ سے استوار کر چکا ہوں اس لئے میری نظر میں اس خطہ کی لادین تہذیب کی کوئی قدر و منزلت نہیں یہ مہک تو صرف ان لوگوں کے لئے پر کشش ہو سکتی ہے جو عیش و عشرت کو اپنا مقصد حیات جانتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید سورت المائدہ میں صاف ارشاد فرمایا ہے کہ ''خبردار یہود و نصاریٰ کے جال میں پھنس کر اللہ کے دین قیم کی رسی نہ چھوڑ دینا'' آج بھی گم کردہ راہ لوگ متاع ایمان لوٹنے کیلئے اپنی تمام تر توانائیاں صرف کر رہے ہیں، روپیہ پانی کی طرح بہایا جا رہا ہے، فتنوں اور سازشوں کا ایک ٹھاٹھیں مارتا ہوا سیلاب اسلامی اقدار کو بہا کر لے جانے کیلئے بڑھتا چلا آ رہا ہے کاش ہم قرآن کی اس تنبیہ پر کان دھریں اور ہوشیار ہو جائیں۔ چور نہیں بلکہ وہ مالک قابل ملامت ہے جو اپنے قیمتی اثاثہ کی حفاظت نہیں کرتا بس یہ دنیا جس کی رعنائیوں میں ہم کھو کر رہ گئے ہیں یہ ہماری عارضی قیام گاہ ہے ہمیں ایک دن یہاں سے رخت سفر باندھنا ہے۔ اور اپنے علیم و خبیر رب کی عدالت میں پیش ہونا ہے آج ہم اپنی بدعملی اور گمراہی پر طرح طرح کے خوبصورت پردے ڈال کر لوگوں کی آنکھوں میں

خاک ڈال سکتے ہیں لیکن اس روز کیا کریں گے جب سب پردے اٹھا دیے جائیں گے اور حقیقت بے نقاب کردی جائے گی۔ ہمیں چاہئے کہ اس دن کا تصور کر کے اپنے باقی ایام زندگی کی اصلاح کرلیں۔ بڑے افسوس کا مقام ہے، جس قوم کی ہدایت کیلئے ایسا مکرم و محتشم رسولؐ مبعوث کیا جائے، قرآن جیسی روشنی اور مدلل کتاب نازل کیجائے اور پھر ہر لمحہ ان کو اسلام کی حقانیت کے معجزات کا مشاہدہ کرایا جائے اور ان کی اصلاح کی انتہائی کوشش کیجائے لیکن وہ قوم پھر بھی پستی سے نکل کر بلندی کی طرف گمراہی سے ہدایت کی طرف باطل سے حق کی طرف ناکامی سے کامیابی طرف بے ایمانی سے ایمان کی طرف شکست و ریخت سے کامیابی و کامرانی کی طرف بے حیائی سے حیا کی طرف ضلالت سے خوداری کی طرف اور سستی سے جدو جہد کی طرف آنے سے انکار کرتی رہے تو اس سے بڑی بدبختی کیا ہوسکتی ہے۔ جیسا کہ آج ہو رہا ہے ساری قوم فرنگی تہذیب کو اپنانے کیلئے اندھی ہو رہی ہے سب سے بڑا ستم یہ ہے کہ حکمران اسلامی ریاستوں کا کلچر ختم کر کے ان کو فرنگی ریاستیں بنانے پر تلے ہوئے ہیں۔ سارے رسم و رواج اور قوانین امریکہ، برطانیہ اور بھارت سے درآمد کیے جا رہے ہیں، قوم کی غیرت کو ختم کیا جا رہا ہے، بے حیائی، عریانی، فحاشی اور عیاشی کو فروغ دیا جا رہا ہے۔ قوم کے وقار اور خودداری کو نیلام کیا جا رہا ہے ڈالروں کی چمک میں دین فروخت ہو رہا ہے۔ عقل کے اندھو ہوش کے ناخن لو قیامت کے روز مالک کائنات کو کیا جواب دو گے۔ نبی مکرمؐ کے پاس شفاعت کیلئے کون سا منہ لے کر جاؤ گے۔ جو ابلیسی کھیل اسلامی دنیا میں کھیل رہے ہو اور جس طرح تم اسلامی اقدار کا مذاق اڑا رہے ہو انشاء اللہ تم اس کی سزا یہاں بھی پاؤ گے اور اگلی دنیا میں بھی ذلت اور رسوائی تمہارا مقدر ٹھہرے گی۔ ابھی وقت ہے سمجھ جاؤ دین اسلام کی سربلندی کیلئے کام کرو، امت مسلمہ کے وقار کیلئے کام کرو، بحثیت مسلمان حکمران اپنی تمام تر ذمہ داریاں پوری کرو فلاح پا جاؤ گے۔ یہی نہیں امر ہو جاؤ گے۔

تعلیم و تربیت

(کرنل فضل ربی)

شب خیزی فرض نماز کے ساتھ ساتھ اُمت کو تہجد کی نماز کی تعلیم بھی دی گئی ہے۔ نبی کریم ﷺ نے صحابہ کرامؓ کو شب خیزی کا خوگر بنا دیا تھا۔ پنجگانہ فرض نماز کی پابندی سے نمازی کے اندر نوافل کی عادت پیدا ہوتی ہے۔ نوافل نماز میں سب سے زیادہ فضیلت والی نماز تہجد کی ہے۔ عبادت کیلئے راتوں کو اُٹھنے کی تربیت عساکر کیلئے زمانہ امن میں گارڈ اور ڈیوٹی پر بروقت پہنچنے میں سہولت پیدا کرتی ہے۔ جنگ اور مشقوں (War/Exercises) کے دوران حملے (ATTACKS) اکثر رات کو ہوا کرتے ہیں لہٰذا نماز تہجد کی عادت سپاہ کو جاگنے (NIGHT ALERT) کا خوگر بنا دیتی ہے نیز راتوں کو اُٹھ کر مانگنے سے اللہ تعالیٰ کی مدد و نصرت یقینی ہو جاتی ہے اس صفت کو قرآن کریم نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

O وَالَّذِينَ يَبِيتُونَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّقِيَامًا (64:25)

یعنی رات کو جب غافل بندے نیند اور آرام کے مزے لوٹتے ہیں یہ اللہ تعالیٰ کے آگے کھڑے اور سجدہ میں پڑے ہوئے رات گزارتے ہیں۔

مشغولیت اسلام عدم مشغولیت اور بے کاری کو ناپسندیدہ نظروں سے دیکھتا ہے۔ کیونکہ بے کار رہنے سے نفس کی جمع شدہ قوتوں میں فساد پیدا ہو جاتا ہے بلکہ سب سے بڑا فساد یہ ہے کہ اس فرصت کو مشغولیت میں بدلنے کی بجائے اپنی جسمانی قوتوں کو تباہ کیا جاتا ہے اور بے کاری میں ضرر رساں عادات اپنا لئے جاتے ہیں۔ (فحش پروگرام دیکھنا، تاش کھیلنا، غیبت کرنا اور چغلی کھانا جیسے عادات) سپاہ اگر شب و روز کی معمولات (Daily Routine) کے ساتھ ساتھ پنجگانہ نماز باجماعت کا اہتمام کریں تو ایسا کوئی لمحہ باقی نہیں رہتا ہے جسے وہ شر، فساد، گناہ اور فضول کاموں میں صرف کریں۔

روزہ روزہ اسلام کے بنیادی ارکانؐ میں سے ہے رمضان المبارک کے روزے مسلمانوں پر فرض کئے گئے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ o (183:2)

اے ایمان والو! تم پر روزے فرض کئے گئے جیسے تم سے پہلے لوگوں پر فرض کئے گئے تھے تا کہ تم میں تقویٰ کی صفت پیدا ہو جائے۔

فرض روزوں کے علاوہ نبی کریم ﷺ نے صحابہ کرامؓ کو نفلی روزوں کا خوگر بنا دیا تھا۔ نماز کی طرح روزہ مختلف زاویوں سے انسان کی روحانی اور جسمانی نشوونما کا ضامن ہے۔ تقویٰ، اطاعت، تنظیم اور کم کھانے کے ساتھ ساتھ روزہ سے ضبطِ نفس کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ جس سے سپاہ کے اندر فقر و فاقہ، سادہ اور محنت طلب زندگی گزارنے، برداشت اور کٹھن سے کٹھن حالات میں بھی حوصلہ نہ ہارنے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے، جو میدانِ جنگ میں ثابت قدم رہنے کیلئے سنہری اصولوں میں سے ایک ہے۔ روزہ سپاہ کی زندگی میں اہمیت کا حامل ہے عسکری زندگی پر روزہ کے کئی اثرات مرتب ہوتے ہیں جن میں سے بعض کا ذکر مندرجہ ذیل ہے۔

قوتِ برداشت ہنگامی حالات میں بھوک اور پیاس سے دوچار ہونا کوئی نئی بات نہیں بلکہ دورانِ جنگ سپاہ کو اکثر فاقے کرنا یا معمولی سی چیز پر گزارہ کرنا پڑتا ہے۔ زمانہ امن میں صحرائی علاقوں میں مشقوں کے دوران پانی کی راشن بندی سے واسطہ پڑتا ہے ایسے حالات سے بخوبی نبرد آزما ہونے کیلئے رمضان المبارک میں روزوں کی فرضیت سے ایک تربیتی کیڈر (Training Cadre) کا اہتمام ہوتا ہے۔

باہمی نزاع کا سدِّباب نبی کریم ﷺ کا ارشاد مبارک ہے کہ **اَلصَّوْمُ جُنَّة** (روزہ ڈھال ہے) شریعت مطہرہ کے مطابق روزہ دار کے لئے ضروری ہے کہ وہ متعین کردہ وقت میں کھانے پینے اور دیگر کئی جائز اُمور سے اجتناب کرے اسی طرح روزہ دار کیلئے لازم ہے کہ وہ روزہ کی حالت میں بدکلامی نہ کرے نہ دنگا فساد کرے۔ اگر کوئی شخص اِس کے ساتھ گالی گلوچ کرے یا لڑنے پر اُتر آئے تو کہہ دے کہ بھائی میں روزے سے ہوں۔ حدیث پاک میں وارد ہے۔

وَاِذَا كَانَ يَوْمُ صَوْمِ اَحَدِ كُمْ فَلَا يَرْفُثْ وَلَا يَصْخَبْ فَاِنْ سَآبَهٗ اَحَدٌ اَوْ قَاتَلَهٗ فَلْيَقُلْ اِنِّیْ امْرُءٌ صَآئِمٌ o (بخاری شریف)

اور جب تم میں کوئی روزہ رکھے تو فحش باتیں نہ کرے نہ غل مچائے اگر اس کو کوئی گالی دے یا اس سے لڑے تو کہدے میں روزہ دار آدمی ہوں۔

حدیث پاک کی رُو سے آپس میں دنگا فساد اور گالی گلوچ سے روزہ دار کے روزے میں خلل واقع ہوتا ہے۔ نیز یہ دنگا فساد مسلمانوں کی کمزوری کا سبب بنتا ہے۔ قرآن حکیم میں ارشادِ ربانی ہے۔

وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَتَذْهَبَ رِيْحُكُمْ وَاصْبِرُوْا ط اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ o (46:8)

اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور آپس میں جھگڑو نہیں ورنہ تمہارے اندر کمزوری پیدا ہو جائے گی اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی صبر سے کام لو یقیناً اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

پورے آداب کو ملحوظ خاطر رکھ کر روزہ رکھنے سے سپاہ کے اندر محبت اور بھائی چارے کے ساتھ رہنے کا جذبہ پروان چڑھتا ہے جس سے اِن کی قوتیں منفی رُجحانات کے بجائے مثبت اُمور پر صرف ہوتی ہیں اور اجتماعی سطح پر تربیت کی راہ نکلتی ہے جو دفاعی اِستحکام میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔

اسلام کے علاوہ دیگر مذاہب میں روزے شمسی سال کے اعتبار سے موجود ہیں اِس لئے اِن میں تغیر و تبدل ناممکن ہے یہ روزے ہمیشہ گرمی میں یا سردی میں واقع ہوتے ہیں اس کے برخلاف اسلام میں روزے قمری مہینوں کے حساب سے فرض ہیں جو موسم اور چھوٹے بڑے دنوں کے لحاظ سے بدلتے رہتے ہیں اِس لئے رمضان کا مہینہ ہر ملک میں ہر موسم میں آتا ہے جس کی وجہ سے اِس کی سختی اور نرمی بدلتی رہتی ہے۔ گویا موسم گرما اور سرما کی اجتماعی مشقوں کا خود بخود اہتمام ہو جاتا ہے۔

زکوٰۃ ملکی دفاع کے لئے جسمانی قربانی کے ساتھ ساتھ مالی قربانی بھی لازمی ہے۔ انفاق فی سبیل اللہ سے روحانی ترقی پا کر تعلق مع اللہ استوار ہوتا ہے۔ اِسی طرح جنگ میں کام آنے

والے ہتھیاروں کی تیاری یا خریداری اور دیگر ضروریات کی تکمیل کا ذریعہ ہے کئی مقامات پر تو جسمانی جہاد سے مالی جہاد کو مقدم رکھا گیا ہے۔

O وَ جَاهِدُوْا بِاَمْوَالِكُم وَاَنْفُسِكُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ۔ (41:9)

اور جہاد کرو اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ اللہ کی راہ میں۔

O تُوْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُم ذٰلِكُم خَيْرٌلَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَo (11:61)

تم ایمان لاؤ اللہ اور رسول پر اور جہاد کرو اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور جسموں کے ساتھ یہ تمہارے لئے بہتر ہے اگر تم جانتے ہو۔

انفاق فی سبیل اللہ کے ذریعہ دل سے مال کی محبت نکل جاتی ہے اور صدقاتِ واجبہ کے علاوہ مسلمان ضرورت پڑنے پر صدقات نافلہ کا بھی اہتمام کرتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ جنگ تبوک کے موقع پر صحابہ کرامؓ میں سے حضرت عثمانؓ نے ایک ہزار درہم پیش کر دیئے۔ اِسی موقع پر ابو عقیلؓ انصاری نے رات بھر مزدوری سے حاصل کئے گے نصف صاع کھجور نبی کریم ﷺ کی خدمت میں پیش کر دیئے۔

حضرت ابو بکرؓ نے اپنا تمام مال و متاع پیش کر دیا۔ حتیٰ کہ کرتے کی گھنڈیاں بھی توڑ کر شامل کر دی تھیں اور رسول اللہ ﷺ کے اِستفسار "**مَابَقَيْتَ (الملك**"۔۔۔؟

(بیوی، بچوں کے لئے کیا چھوڑا) پر صدیق اکبرؓ نے جواب دیا۔ "اللہ اور اِس کا رسول" انفاق فی سبیل اللہ میں خواتین نے بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا یہاں تک کہ ایک دفعہ عید کے موقع پر خواتین نے نبی کریم ﷺ سے صدقہ کی فضیلت سننے پر زیورات اُتار کر خدمت میں پیش کئے۔

حج وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلاً (97:3)

اور اللہ کیلئے لوگوں کے ذمہ اِس مکان کا حج کرنا جو وہاں تک پہنچنے کی اِستطاعت رکھتا ہو۔

ملکی دفاع کیلئے مالی اور جسمانی ہر دو قربانیوں کی ضرورت پڑتی ہے اِسی طرح دفاعی اِستحکام کے

لئے اجتماعی سطح پر کام کرنا بھی ضروری ہے صرف انفرادی کوششوں اور امور سے یہ کام سر انجام نہیں دیا جا سکتا اسلام کے بنیادی رُکن حج کے اندر مالی اور جسمانی دونوں قربانیاں شامل ہیں۔ یہ ایک عبادت ہے جس کے ذریعہ مسلمانوں کے اندر اجتماعیت کا پہلو ترقی کرتا ہے نیز اس کی ادائیگی سے سفر قربانی اور جہاد کی مکمل تربیت حاصل ہوتی ہے۔ دراصل حج حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قربانیوں کا مظہر ہے۔ جنہوں نے عہدے، وطن، جان، بال بچوں اور اکلوتے بیٹے کی قربانی دیکر اپنے آپ کو راہنمائی کے قابل بنایا۔ ارشاد ربانی ہے۔

قَالَ اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّا سِ اِمَا مًا۔ (124:2)

فرمایا میں نے آپ کو لوگوں کیلئے پیشوا ٹھہرایا

اس سرٹیفکیٹ کے عطا ہونے کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام نے "وَمِنْ ذُرِّيَّتِي" (اور میری اولاد) کی درخواست کی۔ مگر ہر ایک کو اس مقام کا اہل نہیں ٹھہرایا گیا۔ اس لئے کہ قربانی اور جہد قیادت کے لئے شرط ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کی اولاد میں نبی مکرم ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے اس فضیلت سے نوازا۔ نبی کریم ﷺ نے انتہائی سختیاں برداشت کیں اور پورے عالم کے پیشوا ٹھہرے نیز قائدین کے لئے قیادت کی عملی مثال قائم کی۔

خانہ کعبہ روئے زمین پر عرش الٰہی کا سایہ اور اس کی رحمتوں اور برکتوں کا مرکز ہے یہ جغرافیائی شیرازہ ہے جس میں ملت کے وہ تمام افراد بندھے ہیں جو مختلف ملکوں اور علاقوں میں بستے ہیں۔ مختلف زبانیں بولتے ہیں مختلف لباس پہنتے ہیں اور مختلف علاقوں میں زندگی بسر کرتے ہیں مگر سب کے سب حجاج کرام ان فطری اختلافات اور طبعی امتیازات کے باوجود ایک گھر کے گرد چکر لگاتے ہیں۔ ایک ہی لباس (وردی) زیب تن کرتے ہیں۔ اور ایک ہی مقام کو مرکز مان کر وطنیت، قومیت اور دیگر امتیازات کو مٹا کر ایک ہی قوم (آلِ ابراہیمؑ) ایک ہی تمدن (ملت ابراہیمی) اور ایک ہی زبان (عربی) پر متحد ہو جاتے ہیں یہی وحدت کا وہ رنگ ہے جو ان تمام مادی امتیازات کو تہس نہس کرتا ہے جو انسانوں۔۔۔۔۔۔؟

میں جنگ و جدل اور فتنہ و فساد کے اسباب ہیں، حج جیسے رُکن کی ادائیگی سے اُمت مسلمہ اپنے

اپنے دفاعی حصار سے نکل کر پورے عالم اسلام کے دفاع پر مرتکز ہو جاتی ہے اور یوں عالمی سطح پر عالم اسلام کے دفاع کیلئے ایک پلیٹ فارم وجود میں آ تا ہے جس کی اساس حج کی ادائیگی ہے۔

مذکورہ ارکانِ اسلام ہر مسلمان پر انفرادی طور پر فرض ہوئے مگر ان کی ادائیگی میں اجتماعیت کا ہونا واضح ہے۔ نماز باجماعت کی ادائیگی ایک ماہ کے روزے، ایک ہی نصاب کے مطابق زکوٰۃ کی ادائیگی اور ایک موسم میں حج کی ادائیگی سے اجتماعی سطح پر کام کرنے کی تربیت ہوتی ہے۔ اس عمل سے ٹیم ورک (Team Work) کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ جس کی بدولت قومی سطح پر کئے جانے والے فریضے جیسے اشاعتِ دین، فلاح و بہبود اور دفاعی اُمور کی تکمیل میں سہولت پیدا ہوتی ہے۔

سپہ سالار اعظم ﷺ نے صحابہ کرامؓ کی تعلیم و تربیت کا اہتمام کیا تاکہ نوزائیدہ مملکت (مدینہ منورہ) کا مستحکم دفاع ہو سکے۔ اِس سلسلے میں اختیار کئے گئے چند مزید اقدامات کا ذکر مندرجہ ذیل ہے۔

صفہ کا قیام ہجرت کے ساتھ نبی کریم ﷺ نے مسجد نبوی کی تعمیر شروع کی مدینہ کے مرکز میں یہ مسجد عبادت گاہ کے ساتھ ساتھ دفاعی اُمور کا مرکز بھی تھی یہاں سے عساکرِ اسلامی کو مختلف مہموں پر روانہ کیا جاتا تھا۔ میدانِ جنگ کے لئے جھنڈے تیار ہوتے معاہدے یا صلح نامے تحریر ہوتے ۔ دفاعی تیاری اور جنگی سکیموں پر مشاورت ہوتی ، اِسی مسجد کو دارالشوریٰ، دارالعبادت، دارالتعلیم و تدریس اور دارالعسکر کی حیثیت حاصل تھی۔ نبی کریم ﷺ نے مسجد کو صرف ذکر و عبادات کے لئے مخصوص نہیں فرمایا بلکہ سب سے اہم کام تعلیم و تربیت کا پہلا مرکز مسجد نبویؐ بنا۔ مسجد کے صحن میں نبی کریم ﷺ نے ایک چبوترہ قائم کیا۔ جس کے اندر مہاجرین اور انصار کی ایک جماعت ہمہ وقت دینی تعلیم و تربیت کی خاطر اِس اقامتی درسگاہ (RESIDENTIAL SCHOOL) میں موجود رہتی یہ کچھ صحابہ کرامؓ کا مستقل مسکن بھی تھا اور کچھ دن کو درس میں بیٹھتے اور شام کو اپنے اپنے گھروں کو لوٹ کر کاموں میں مصروف ہو جاتے۔ باقاعدہ طالب علموں کے علاوہ وقتی طالب علمی (PART TIME SCHOLAR) کلاس سے باہر کسب حلال کر کے اپنی اور دیگر طلباء کی کفالت کرتے۔

اِس درسگاہ میں ایمان، تقویٰ اور جہاد فی سبیل اللہ کے فضائل و احکام اور مال غنیمت کے علاوہ نشانہ بازی، گھڑسواری اور تیراکی جیسی تربیت شامل تھی۔ سید سلیمان ندوی نے اس علمی مرکز کا نقشہ کچھ یوں کھینچا ہے۔

"کہیں ابوبکرؓ و عمرؓ و عثمانؓ و علیؓ جیسے فرمانروا زیرِ تعلیم ہیں۔ کہیں طلحہؓ، زبیرؓ، معاویہؓ، سعد بن معاذؓ اور سعد بن جبیرؓ جیسے اربابِ رائے و تدبیر ہیں۔ کہیں خالدؓ، ابوعبیدہؓ، سعد بن ابی وقاصؓ اور عمرو بن العاصؓ جیسے سپہ سالار ہیں۔

کہیں وہ ہیں جو بعد کو صوبوں کے حکمران، عدالتوں کے قاضی اور قانون کے مقنن ہیں۔ کہیں اِن زہاد و عباد کا مجمع ہے جن کے دن روزوں میں اور راتیں نماز میں کٹتی ہیں، کہیں ابوذرؓ، سلیمان و ابودرداؓ جیسے وہ خرقہ پوش ہیں جو مسیح اسلام کہلاتے تھے۔ کہیں صفہ والے طالب علم تھے جو جنگل سے لکڑی لا کر بیچتے اور گزارہ کرتے اور دن رات علم کی طلب میں مصروف رہتے تھے۔ کہیں حضرت عائشہؓ، حضرت ابن عباسؓ، حضرت ابن مسعودؓ اور حضرت زید بن ثابتؓ جیسے فقیہہ و محدث تھے۔ جن کا کام علم کی خدمت و اشاعت تھا۔

یاد رہے کہ نبی کریم کے عہد مبارک میں مستقل فوج (Standing Army) نہیں تھی۔ بلکہ ضرورت پڑنے یا بلانے پر ہر مسلمان کے ذمہ فرض تھا کہ اپنی خدمات پیش کرے۔ ایسے حالات میں اصحاب صفہ ایک مستقل فوج کی حیثیت سے کام دیتے تھے گھر سے دور بیوی بچوں سے بے پرواہ اور مادی سامان کے اعتبار سے یہ ہلکے پھلکے صحابہؓ چند منٹوں میں تیار ہو کر مہم پر روانہ ہو جاتے تھے۔ مثلاً کسی نے ایک دفعہ مدینہ آ کر کسی گھر پر چھاپہ مارا تو ضرورت تھی کہ مجرموں کے فوری تعاقب کے لئے فوج کا کچھ حصہ روانہ کیا جائے ایسی ہنگامی صورت کیلئے اصحاب صفہ نہایت ہی مناسب وقت پر کارروائی کرتے۔

فدیہ میں تعلیم قبول کرنا علم کی اہمیت بتانے کے ساتھ ساتھ نبی کریم ﷺ نے حصول تعلیم کے لئے انتظامات بھی فرمائے تا کہ حصول علم آسان تر ہو جائے۔ صفہ کے قیام کے علاوہ نبی کریم ﷺ نے جنگ بدر کے موقعہ پر پڑھے لکھے قیدیوں سے مالی فدیہ لینے کی بجائے انہیں چند

(دس دس) مسلمان بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھانے کی شرط پر رہا کیا۔ اس واقعہ سے ایک طرف تو تعلیم کے لئے حتی الوسع انتظامات کا ثبوت ملتا ہے تو دوسری طرف غیر مسلم اساتذہ سے مروجہ تعلیم حاصل کرنے کا جواز بھی ملتا ہے۔ اِس لئے کہ قیدیوں کا تعلق کفارِ مکہ سے تھا جبکہ شاگرد مدینہ کے مسلمان تھے۔ کاتب وحی اور جامع قرآن حضرت زید بن ثابتؓ نے انہی قیدیوں سے تعلیم کی ابتدا کی تھی۔

<u>عقد مواخات و تربیت</u> تعلیم و تربیت کو پروان چڑھانے میں افادہ و استفادہ سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے، عقد مواخات سے انصار مہاجرین کے اندر باہمی تعلق اور اخوت کی فضاء قائم ہوئی۔ جس سے معاشی استحکام کے علاوہ انصار صحابہ کرامؓ کی تربیت کا انتظام بھی ہوا۔ اس لئے کہ مہاجر صحابہ کرامؓ پر نبی کریم ﷺ کی مبارک صحبت و تعلیم کا اثر عرصے سے موجود تھا اور انصار صحابہؓ سے کہیں زیادہ ان کی تربیت ہو چکی تھی۔ عقد مواخات کے قیام سے انصار و مہاجر ایک دوسرے کے ساتھ گھل مل گئے۔ انصار کے ساتھ مہاجر کا رشتہ نبی کریم ﷺ نے ایک خاص انداز اور مناسبت سے طے کیا۔ ایک دوسرے کے مال میں شرکت اور ایک گھر میں سگے بھائیوں کی طرح رہنے سے نہایت قریب سے ایک دوسرے کو دیکھا گیا اِس قرب کی وجہ سے انصار صحابہؓ کے لئے از خود ظاہری و باطنی۔۔۔۔۔۔۔؟

تربیت کا موقع فراہم ہوا۔

<u>تعلیم و تربیت کیلئے دیگر اقدامات</u> مکہ مکرمہ میں مسلمانوں کا سب سے پہلا تبلیغی مرکز دارارقم تھا یہ مکان ارقم بن ارقم کا تھا جو کہ کوہِ صفا کے دامن میں واقع تھا۔ نبی کریم یہاں پر اشاعتِ اسلام اور نو مسلموں کی تربیت کا کام سرانجام دیتے۔

- یثرب کے کچھ لوگوں کے قبول اسلام پر نبی کریم ﷺ نے قبل از ہجرت مصعب بن عمیرؓ کو قرآنی تعلیم کیلئے اِن کے ساتھ بھیجا۔
- حضرت معاذ بن جبلؓ اور ابو موسیٰ اشعریؓ کو یمن میں ناظم تعلیمات بنا کر بھیجا گیا، اور انہیں یہ ہدایت دیں۔

"لوگوں کے ساتھ آسانی سے پیش آنا، انہیں سختی میں نہ ڈالنا، خوشخبری اور بشارت انہیں سنانا۔ دین سے نفرت نہ دلانا۔ اور آپس میں مل جل کر رہنا۔

- یہودیوں کے ساتھ خط و کتابت کرنے کیلئے نبی کریم ﷺ نے حضرت زید بن ثابتؓ کو عبرانی زبان سیکھنے کے لئے باہر بھیجا۔
- عورتوں کی تعلیم اور انہیں شرع کے حکم بتلانے کیلئے نبی کریم ﷺ نے ایک دن خاص کیا تھا۔
- رسول اللہ ﷺ گھوڑوں کی تربیت کے لئے گھڑ دوڑ کرایا کرتے تھے اور فاصلے کی لمبائی چھ سات میل لمبی ہوتی تھی۔ کبھی یہ فاصلہ ایک دو میل بھی ہوا کرتا تھا۔
- مسجد نبوی میں حبشی نوجوانوں کو برچھوں کی مشق کرتے ہوئے نبی کریم ﷺ نے مع حضرت عائشہؓ کے ملاحظہ فرمایا۔

جنگی اسلحے کی صنعت سیکھنے کے لئے نبی کریم ﷺ نے دو صحابہ کرامؓ، حضرت عروہ بن مسعودؓ اور حضرت غیلان بن اسلم کو ۸ ہجری میں غیر ملکی شہر جرش کو روانہ کیا تھا جو دبابے منجنیق اور جنور کی صنعت سیکھ رہے تھے۔

دورِ جدید کے تقاضوں کے پیش نظر پاکستان میں ایسے مراکز اور اداروں (**CENTRES / INSTITUTIONS**) کی بہتات ہے جہاں عسکری تربیت دی جاتی ہے۔ مگر یہ مراکز اور ادارے صرف پیشہ ور افواج کی تعلیم و تربیت کیلئے مخصوص ہیں، دفاعی استحکام کیلئے ضروری ہے کہ عوام کے لئے بھی الگ یا اِن اداروں میں عسکری تربیت کا انتظام کیا جائے۔ مرد و زن دونوں کیلئے میٹرک تک تعلیم مفت اور لازمی قرار دیجائے۔ تاکہ ضرورت پڑنے پر تمام تر ذمہ داری صرف پیشہ ور فوج کے کندھوں پر نہ ہو۔ بلکہ ملک کا ہر فرد اس ذمہ داری میں شریک ہو اور یوں پوری قوم **كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْص**۔ (گویا سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہو) کی مانند ہو۔ آج کے اس سائنسی دور میں صرف تعلیم ہی وہ ہتھیار ہے جس کی وجہ سے ہم جدید ٹیکنالوجی (**MODERN TECHNOLOGY**) سمجھ سکتے ہیں، اپنے ماضی سے سبق سیکھ کر مستقبل کے لئے منصوبہ بندی کر سکتے ہیں اور دشمن کے تباہ کن پروپیگنڈے سے متاثر ہوئے بغیر ملکی دفاع کے اہل بن سکتے ہیں۔ (جاری)

عہد نبویؐ میں یہودی سازشیں

(ڈاکٹر خواجہ عابد نظامی)

رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے قبل یہودی پورے عرب میں پھیلے ہوئے تھے۔ ان کی بستیوں کا سلسلہ ریلہ، مقنہ، خیبر، وادی القرا، تیما، فدک، یثرب (مدینہ) اور طائف سے لیکر یمن اور عمان و بحرین تک پھیلا ہوا تھا۔ مکہ میں جب عکاز اور ذوالمجاز وغیرہ میلے منعقد ہوتے تو اردگرد کے علاقوں سے یہودی خاص طور پر ان میلوں میں شریک ہوتے۔ کہانت اور علم النجوم کے ذریعہ اہل مکہ کو ان کی قسمت کا حال بتاتے اور یوں ان کے دل بہلاوے کا سامان کر کے روپے بٹورتے۔

یہودیوں کی مقدس کتاب میں نبی آخرالزماں صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد کا ذکر بڑی صراحت کے ساتھ موجود تھا۔ لیکن اسکے باوجود انہوں نے اپنی مقدس کتاب کے ساتھ نافرمانی کا رویہ اختیار کیا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ دشمنی میں پیش پیش رہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات میں یہود کی دشمنی کا پہلا تعارف ہم سے اس وقت ہوتا ہے، جب بچپن میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی دائی حضرت بی بی حلیمہؓ کی گود میں مکہ کے ایک میلہ میں جاتے ہیں۔ جہاں ایک فال دیکھنے والا یہودی آپؐ کو دیکھ کر شور مچاتا ہے کہ اے یہودیو! دوڑو، اس بچے کو قتل کر دو۔ یہی وہ بچہ ہے، جو نبی آخرالزماں ہے اور جسکا ذکر مقدس کتابوں میں ہے۔ یہ مستقبل میں تمہیں بہت نقصان پہنچائے گا۔

ہجرت کے بعد رسول صلی اللہ علیہ وسلم یثرب (مدینہ منورہ) میں تشریف لائے تو یہاں کم و بیش چالیس پچاس فیصد آبادی یہودیوں کی تھی۔ جو کافی مالدار تھے۔ اور قلعہ نما بستیوں میں محفوظ طریقہ سے رہتے تھے۔ ان کے تین بڑے قبیلے تھے (1) بنی قنیقاں (2) بنی نضیر (3) بنی قریظہ۔ بنی قنیقاع زرگر یعنی سنار تھے۔ زیور بنا کر بیچا کرتے تھے اور سود پر لوگوں کو قرضہ بھی دیتے تھے۔ بنی نضیر زراعت پیشہ تھے۔ ان کے کھجوروں کے باغات تھے اور بنو قریظہ جوتے وغیرہ بنانے کا کام کرتے تھے۔ موچیوں کا کام کرنے کی وجہ سے انہیں کم ذات اور حقیر سمجھا جاتا تھا۔ لیکن یہ لڑنے بھڑنے کے کاموں میں پیش پیش رہتے تھے۔ گویا زراعت، تجارت اور صنعت پر پوری طرح یہودیوں کا قبضہ تھا۔ مدینہ منورہ تشریف لانے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سب سے زیادہ ان یہودیوں کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔

رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ میں شہری مملکت کا دستور مرتب و نافذ فرمایا، تو اس میں یہودیوں کو

بھی شریک کیا۔اس دستور کی اولین خلاف ورزی 3ھ میں بنی قنیقاع نے کی کہ ایک مسلمان عورت کی بے حرمتی کی۔ جس پر کشت وخون ہوا۔رسول اللہ ﷺ تبلیغ دین کو ہر چیز پر مقدم رکھتے تھے۔چنانچہ آپؐ بنوقنیقاع کی بستی میں تشریف لے گئے اور انہیں اسلام لانے کی دعوت دی۔مگر انہوں نے انتہائی بے جا اور الٹی سیدھی باتیں کیں۔ جس پر مسلمانوں نے ان کی بستی کا محاصرہ کرلیا۔آخر پندرہ روز کے بعد ان کی غیر مشروط اطاعت پر رسول اللہ ﷺ پھر ان کے پاس گئے اور اسلام کی تبلیغ فرمائی مگر انہوں نے اپنی وہی سابقہ روش اپنائی۔جس پر انہیں حکم دیا گیا کہ اپنی غیر منقولہ جائیداد بیچ کر اور منقولہ جائیداد ساتھ لے کر تین دن کے اندر مدینہ چھوڑ کر چلے جائیں۔ اس کے بعد یہ لوگ اذرعات (فلسطین) چلے گئے،لیکن ان کو اجازت تھی کہ تجارت کی غرض سے جب چاہیں مدینہ مین آیا کریں،لیکن یہاں ان کا قیام تین روز سے زیادہ نہیں ہوگا۔

بنی قنیقاع کے اس واقعہ کے چند ماہ بعد احد کا معرکہ پیش آیا۔جس میں مسلمانوں کو سخت نقصان پہنچا۔اس موقعہ پر یہودی خفیہ طور پر سازشوں میں مصروف رہے۔ڈاکٹر حمید اللہ خاں نے اپنی کتاب ”رسول اکرم ﷺ کی سیاسی زندگی“ میں لکھا ہے کہ جنگ بدر کے بعد کعب بن اشرف نامی ایک یہودی (جس کی والدہ بنی نضیر سے تعلق رکھتی تھی) قریش کو مسلمانوں پر حملہ کرنے کی خفیہ دعوت دیتا رہا اور انہیں اپنی پوری مدد کا یقین بھی دلاتا رہا۔لیکن حکومت اسلامیہ کی خبر رسانی کا نظام قابل رشک تھا۔رسول اکرم ﷺ کو اس سازباز کی خبر ہوگئی اور مسلمانوں نے اس غدار باغی کو دنیا سے رخصت کردیا۔

معرکہ احد کے چند ماہ بعد 4ھ میں بھی اسی قسم کا ایک واقعہ پیش آیا۔نجد کے قبیلہ بنی عامر کا ایک سردار ابو براہ ملاعب الاسنہ مدینہ آیا۔وہ اپنے جھوٹے غرور کے باعث اگرچہ مسلمان نہ ہوا تھا،لیکن رسول اللہ ﷺ سے درخواست کی کہ کچھ مبلغ اس کے علاقہ میں بھیجے جائیں،وہ ہر طرح سے ان کی حفاظت کا ذمہ دار ہوگا۔ابو براء اور اسکے بھتیجے عامر بن طفیل کے درمیان سخت ان بن تھی۔جب ستر مسلمان مبلغوں کا یہ وفد نجد میں بئر معونہ پہنچا،تو اس نے رسول اللہ ﷺ کا تبلیغی خط عامر بن طفیل کو پہنچایا،لیکن اس نے پڑھے بغیر ہی اسے چاک کردیا اور جوش غضب میں اپنے ساتھیوں کی مدد سے ان مبلغوں پر اچانک دھاوا بول کر سب کو قتل کردیا۔صرف ایک حضرت عمرو بن امیہ کی جان بخشی کی۔جنہوں نے مدینہ آکر سب حالات رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں

عرض کیے۔

یہودیوں کا قبیلہ بنی نضیر اس قبیلہ (بنی عامر) کا حلیف تھا۔ بنی عامر پر مبلغین کے قتل کا جو الزام تھا، اس میں بنی عامر کے حلیف بھی شریک سمجھے جا سکتے تھے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ بذات خود بنی نضیر کے پاس ان کی بستی میں تشریف لے گئے۔ جو مدینہ سے کئی میل دور جنوب میں واقع تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے انہیں معاہدہ کی ذمہ داریاں یاد دلائیں۔ لیکن انہوں نے صریحاً ٹال مٹول سے کام لیا اور رسول اللہ ﷺ کو جان بوجھ کر انتظار کرایا۔ جب دھوپ زیادہ تیز ہوگئی، تو آپؐ ایک یہودی کی گڑھی کے سائے میں جا بیٹھے۔ یہودیوں نے جب رسول اللہ ﷺ کو گڑھی کے سائے میں آرام فرماتے پایا، تو ان کے سازشی ذہن میں یہ سکیم آئی کہ اس موقع سے فائدہ اٹھایا جائے اور گڑھی کے اوپر سے رسول اللہ ﷺ پر چکی کا پاٹ پھینک دیا جائے تاکہ (نعوذ باللہ) آپکی زندگی کا خاتمہ ہو جائے۔ لیکن رسول اللہ ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے اس سازش سے خبردار فرما دیا اور آپؐ وہاں سے اٹھ کر اس طرح واپس آ گئے کہ کسی کے دل میں کوئی شبہ نہ پیدا ہو۔ اس واقعہ کے بعد مسلمانوں نے بنی نضیر کی بستی کا محاصرہ کر لیا۔ لیکن یہودیوں نے اطاعت قبول کر لی۔ اس مرتبہ بھی ان کے ساتھ کافی رعایت برتی گئی اور ہر شخص کو ایک ایک اونٹ اور سامان لے کر مدینہ سے چلے جانے کی اجازت دے دی گئی۔ ڈاکٹر حمید اللہ خاں کے مطابق "اس موقع پر بھی انہوں نے سرزوری دکھائی اور گاتے بجاتے اس طرح مدینہ سے رخصت ہوئے، جیسے فتح انہی کی ہوئی ہے۔ انہوں نے اپنے گھر اور باغ تو بیشک چھوڑے لیکن گھروں کے دروازے اور چوکھٹ تک اکھاڑ کر لے گئے"

یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ جلاوطنی کے اس حکم پر بنو نضیر کے یہودیوں نے کہا کہ ہم نے بعض مقامی باشندوں سے اپنے قرضے وصول کرنے ہیں۔ تو رسول اللہ ﷺ نے اجازت دے دی کہ وہ اپنے یہ قرضے وصول کر لیں اور حساب بیباق کر لیں۔ رحمت عالم ﷺ کی ان فیاضیوں اور حسن سلوک کے باوجود یہودیوں کا طرز عمل روز بروز اخلاق و تہذیب سے گرتا جا رہا تھا۔ جب وہ آپ کی خدمت میں آتے تو "السلام علیک" (تم پر سلامتی ہو) کے بجائے "السام علیک" (تم پر موت آئے)" کہتے اور "راعنا" (ہماری رعایت کریں) کے بجائے زبان موڑ کر" راعینا (ہمارے چرواہے)" کہتے اور دل میں بہت خوش ہوتے کہ ہم نے رسول اللہ ﷺ کی

توہین کی ہے۔رحمت عالم ﷺ ان کی اس گھٹیا اور اخلاق سے گری ہوئی حرکت سے واقف تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ ایک صحابی نے آپؐ کی توجہ "السام علیک" کہنے والے ایک یہودی کی طرف منعطف کرائی تو آپؐ نے جواب میں فرمایا "ہاں! میں انکے جواب میں 'وعلیک (اور تجھ پر بھی)' کہہ دیتا ہوں۔" یہودیوں کی ان بیہودہ حرکات پر قرآن مجید میں وحی ربانی کا انداز بھی سخت تر ہوتا چلا گیا۔ قرآن نے مسلمانوں کو یہ تعلیم دی کہ وہ "راعنا" کے بجائے "انظرنا (ہم پر نظر کرم فرمایئے)" کا لفظ استعمال کیا کریں۔ اسکے بعد قرآن مجید میں یہودیوں کی خصلتیں اس طرح بیان ہونا شروع ہوئیں۔ (1) مذہبی کتابوں میں تحریف کرنے والے 4/44، (2) پیسوں کی خاطر جھوٹے خلاف شرع فتوؤں سے اپنی ملت کو گمراہ کرنے والے 2/79، (3) سود خوری اور حرام خوری والے (4) توریت کے احکام کو پس پشت ڈالنے والے 2/101، اپنے انبیاء کو قتل کرنے والے 2/61، وغیرہ۔ نیز مسلمانوں کو تشفی دی گئی کہ وہ ان یہودیوں کے ایمان نہ لانے سے دلگیر نہ ہوں۔ یہ قوم تو ہمیشہ سے ہی ایسی رہی ہے۔ ان کی گمراہیوں اور کفر کے باعث ان پر ذلت اور مسکنت (غریب الوطنی) کا عذاب صدیوں سے نازل ہے۔

بنو نضیر کے یہودی جلاوطنی کے بعد خیبر میں جا کر آباد ہو گئے۔ لیکن وہاں بھی ان کی تمام تر توانائیاں مسلمانوں کے خلاف صرف ہونے لگیں۔ وہ مکہ جا کر قریش کو حملہ کیلئے اکساتے اور انہیں ہر طرح اپنی مدد کا یقین دلاتے۔ اس کے ساتھ ہی وہ غطفان اور فرازہ کے قبائل کو بھی مدینہ پر حملہ کرنے کی ترغیب دیتے۔ چنانچہ احزاب (یعنی حلیفوں) کا معرکہ خندق میں مدینہ کا محاصرہ کرنے کیلئے آنا، یہ انہی یہودیوں کی کوششوں کا نتیجہ تھا۔

مدینہ سے خارج البلد ہونے والے یہودیوں نے خیبر میں اپنی قوت مجتمع کر لی تھی۔ ان کی شہ پر اب بنو غطفان بھی فساد برپا کرنے لگے تھے اور یہ بات یقینی تھی کہ جنگ کی صورت میں دونوں متحد ہو کر مسلمانوں کے خلاف لڑیں گے۔ ان حالات میں رسول پاک ﷺ نے خاص حکمت سے کام لیا اور اسلامی فوج کو لیکر آگے بڑھے۔ آپؐ نے ان دونوں گروہوں میں سے کسی ایک پر براہ راست چڑھائی نہیں کی۔ بلکہ خیبر اور غطفان کی درمیانی سمت میں پیش قدمی کرتے چلے گئے۔ اس کا اثر یہ ہوا ان میں سے ہر ایک یہ سمجھا کہ حملہ اس پر ہونے والا ہے۔ چنانچہ غطفان کے وہ دستے جو خیبر والوں کی حفاظت اور مدد کو گئے تھے۔ فوراً واپس آ گئے۔ اس طرح خیبر کے

یہودی تنہا رہ گئے اور کوئی گروہ کسی دوسرے کی مدد کے قابل نہ رہا۔ یوں آپؐ نے اچانک حملہ کر کے غطفان پر قبضہ کرلیا اور ادہر پھر خیبر کا رخ کیا اور علاقے کے تمام آکام (گڑھیاں) فتح کر لئے۔ خیبر کے غزوہ میں بڑی دشواریاں پیش آئیں۔ یہاں یہود پورے جنگی سازوسامان کے ساتھ قلعہ بند تھے۔ بارہ روز محاصرہ کے بعد بھی جب کامیابی نہ ہو سکی، تو تیرہویں روز رسول اللہ ﷺ خود میدان میں پہنچے اور حضرت علیؓ کو سپہ سالار مقرر فرمایا، جنہوں نے ایک طوفانی حملہ میں خیبر کو فتح کر کے اس کے سردار کنانہ بن ربیع کو گرفتار کرلیا۔

غزوہ خیبر کے بعد وادی القریٰ کے قبائل نے آپؐ کی اطاعت قبول کرلی۔ اسکے بعد یہودیوں میں سر اٹھانے کو حوصلہ نہ رہا۔ محمد مار ماڈلوک پکھتال نے اپنے انگریزی ترجمہ "قرآن کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ نبی آخر الزماں ﷺ کی بعثت کے وقت یہودیوں کا تصور یہ تھا کہ اب یہودی قوم دنیا میں حکمرانی حاصل کرلے گی، لیکن جب وہاں شعوب وقبائل کی مساوات اور "**ان اکرمکم عنداللہ اتقاکم** (اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ محترم صرف وہی ہے، جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہو) کا اصول قائم ہوگیا، تو ان کا حکمرانی کا خواب چکنا چور ہوگیا۔ اور وہ بالکل مایوس اور برگشتہ ہوگئے۔ کیونکہ کلام الٰہی کے مطابق تو وہ انسانوں کا استحصال کرنے والے اور سودخوری اور حرام خوری کا سلسلہ قائم رکھنے والے تھے۔ زہد وتقویٰ اور پرہیزگاری سے انکا کیا تعلق تھا؟

تالیف قلبی

(عہد نبویؐ کی سیاست خارجہ کا ایک اہم اصول)

ڈاکٹر محمد حمید اللہ

پہلی اسلامی مملکت عہد نبویؐ میں قائم ہوئی۔ اس کی خارجہ سیاست کے بہت سے اصول تھے۔ ان پر الگ الگ بحث کئے بغیر نہ ان کی اہمیت سمجھ میں آسکتی ہے اور نہ ان کا صحیح مفہوم۔ یہاں صرف ایک چیز پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی جاتی ہے، وہ غیر ممالک کے باشندوں کا دل موہ لیتا ہے۔

سوال کرنے والا پوچھ سکتا ہے کہ اس کا کیا ثبوت کہ مملکت اسلامیہ کی خارجہ سیاست میں یہ اصول عہد نبویؐ میں ملحوظ رہا؟ مگر نظری احکام اور عملی نظائر کی روشنی میں اس استنباط کے سوا چارہ نہیں رہتا۔

اولاً قرآن مجید میں سرکاری موازنے کے لئے خرچ کے جو مدات مقرر کیے گئے ہیں ان میں عام محتاجوں، مسکینوں وغیرہ کے ساتھ ایک اہم مد ''**المولفة قلوبهم**'' کی دی گئی ہے، کہ دلوں کے موہ لینے کے لئے خرچ کیا جانا چاہئے۔

جو چیز قرآن مجید میں موجود ہو اور جناب رسالت مآبؐ کا زندگی بھر اس پر عمل رہا ہو، اور اس کی منسوخی کے امکان کا اشارۃً کنایۃً تک کسی حدیث نبویؐ میں ذکر نہ ہو تو محض بعض متاخر فقہاء کا بیان کہ یہ منسوخ شدہ حکم ہے، کسی راسخ العقیدہ مقلد کے لئے قابل قبول نہیں رہتا۔ ان فقہاء کو حضرت عمر فاروقؓ کے شاید ایک جملے سے دھوکا ہوا۔ سیاق وسباق سے بچھڑا ہوا بیان ایک خالص سیاسی معاملے کے متعلق بعض غیر سیاستداں (مگر نیک طینت و نیک نیت) فقہاء کی سمجھ میں نہ آیا ہو تو اس سے رسول اللہؐ کے جاری و باقی رکھے ہوئے، حکم قرآنی کو منسوخ کرنے کی ذمہ داری لینی کم از کم مجھے تو پسند نہیں۔ اصل میں حضرت عمرؓ کی طرف یہ بیان منسوب ہے کہ اب اسلام نے خدا کو عزت دی ہے، اس لئے کسی کو اسلام لانے کی ترغیب دینے کیلئے رقم خرچ کرنے کی ضرورت

نہیں۔ اگر یہ روایت صحیح بھی ہے تو کیا **اذا فات الشرط فات المشروط** کی بنا پر یہ ناگزیر نہیں کہ دیگر زمانوں میں اور دیگر ممالک کی حد تک جہاں شوکت فاروقی کارفرما نہ ہو، یہ حکم پھر بحال ہو جائے؟ یوں بھی دل موہ لینے یا تالیف قلبی کی صرف یہی ایک شکل نہیں ہے کہ اسلام قبول کرنے کی ترغیب دینے کے لئے کسی کو انعام و اکرام دیا جائے۔

پانچویں صدی ہجری کے وسط میں وفات پانے والے مشہور حنبلی امام ابویعلیٰ انصراء نے اپنی کتاب الاحکام السلطانیہ (صفحہ 116 طبع مصر، میں) آیت "**المولفة قلوبهم**" کی بڑی گہری اور دُور رس تشریح کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں:۔

رہے مولفہ القلوب، سو ان کی چار قسمیں ہیں:۔

1۔ ایک قسم ان لوگوں کی ہے جن کے دل مسلمانوں کو مدد دینے کیلئے موہ لیے جاتے ہیں۔

2۔ ایک قسم ان کی ہے جن کی تالیف قلبی اس لئے کرنی ہے کہ وہ مسلمانوں کو نقصان پہنچانے سے باز رہیں۔

3۔ ایک قسم ان لوگوں کی ہے جن کو اسلام قبول کرنے کیلئے ترغیب دی جاتی ہو۔

4۔ اور ایک قسم ان لوگوں کی ہے جن کی تالیف قلبی سے ان کی قوم اور خاندان والوں کو اسلام لانے کی ترغیب ہوتی ہو۔

چنانچہ یہ چیز جائز ہے کہ ان اقسام میں سے ہر ایک کو مولفہ القلوب کی مد سے حصہ دیا جائے، چاہے وہ مسلمان ہو یا مشرک۔

ابن رشد نے اپنی مستند تالیف **بدایة المجتهد** (کی کتاب الزکاۃ، جملہ خامسہ، فصل اول، مسئلہ دوم) میں بیان کیا ہے کہ امام ابوحنیفہ اور امام شافعی بھی اسی کے قائل تھے کہ یہ قرآنی حکم منسوخ نہیں ہوا بلکہ اب تک باقی ہے، اور امام وقت اس سے مصالح اسلامی کا کام لے سکتا ہے۔

اہل سنت کے تین بڑے مذاہب کے مستند نمائندوں کی رائے معلوم کرنے کے بعد یہ عقلی دلیل اضافہ کی جاسکتی ہے کہ ہر زمانے میں اور ہر ملک میں متمدن سلطنتوں کو اس کی ضرورت رہتی

ہے کہ:۔

1۔ دشمن کو دوست اور مددگار بنانے کے لئے۔

2۔ یا کم از کم غیر جانبدار ہو جانے کے لئے۔

3۔ اور دوستوں کو انعام دے کر مزید اور عظیم تر کارگزاریوں پر آمادہ کرنے کے لئے۔

4۔ نیز دیگر دوستوں کو ترغیب و تشویق دلانے کے لئے۔

5۔ یا ڈھلمل لوگوں کو تائید میں مستحکم کرنے کے لئے۔

6۔ یا مماثل مصالح کے لئے۔

اس کی ضرورت رہتی ہے کہ ''سیکرٹ سروس'' سے کام لیں۔ اس اجمال کی بیسیوں تفصیلیں ہو سکتی ہیں۔

اب ہم سیرۃ النبیؐ کے حصہ نظائر پر نظر ڈالیں گے۔

ابھی مکہ فتح نہیں ہوا تھا کہ ایک مرتبہ وہاں سخت قحط پڑا۔ آنحضرتؐ نے بروایت فقیہ کبیر، سرخسی (مبسوط 10/92,91 وغیرہ) ابوسفیان کے پاس پانچ سو اشرفیوں کی خطیر رقم بھیجی کہ مکے کے غریبوں اور محتاجوں میں تقسیم کرے۔ اس پر ابوسفیان نے بے بسی کے عالم میں جھنجھلا کر کہا کہ: ''محمدؐ چاہتا ہے کہ اب مکے کے غرباء اور نوجوانوں کو ورغلا کر بھٹکائے اور ہمارے خلاف کھڑا کر دے۔ (اوپر ف 305)

ابھی صلح حدیبیہ نہیں ہوئی ہے اور مسلمانوں کے معاشی دباؤ کے باعث قریش کی تجارت بند ہو کر روزگار پر آفت لا چکی ہے۔ ابوسفیان کا روزگار بھی تجارت ہی سے تھا۔ آنحضرت اُسے مدینے کی اچھے کھجوروں کی ایک بڑی مقدار بھیجتے ہیں اور معاوضے میں طائف کا چمڑا طلب فرماتے ہیں، جس کا اسٹاک شامی راستے کی بندش کی وجہ سے ابوسفیان کے پاس پڑا پڑا خراب ہو رہا ہو گا۔ (ابوعبید، کتاب الاموال، ف)

مکے میں مذکورہ بالا قحط کا زمانہ ہے۔ وہاں غلے کی درآمد مشرقی عرب خاص کر یمامہ سے

ہوا کرتی تھی، یمامہ کے ایک سردار ثمامہ بن اثال نے اسلام قبول کر لیا اور آنحضرت کی اجازت سے یہ حکم دیا کہ اس کے علاقے سے اب غلہ کے لئے برآمد نہ کیا جائے۔ مکے والے بیٹ سے مجبور ہو گئے اور جناب رسالت مآب کو اپنی رشتہ داری اور صلہ رحمی کا واسطہ دے کر خط لکھا کہ یمامہ سے غلہ کی مکے کو برآمد کی ممانعت منسوخ کر دی جائے۔ آنحضرتؐ نے ایسا ہی کیا۔ کیا یہ سب کچھ اہل مکہ پر بے اثر رہا ہوگا؟

یہ غیر مسلموں کو اسلام کے حق میں متاثر کرتا تھا۔ اس کے علاوہ نو مسلموں کو بھی بڑے بڑے انعام و اکرام دیئے جاتے۔ ان کے اعزاز ملحوظ رکھے جاتے، اور ہر طرح ان کو محسوس کرایا جاتا کہ صرف روحانی اور اخروی ہی نہیں، دنیاوی اور مادی حیثیت سے بھی ان کا جدید مذہب ان کیلئے سراسر مفید ہے۔ علاوہ اور مواقع کے فتح مکہ کے بعد ابو سفیانؓ وغیرہ نو مسلموں کو سینکڑوں اونٹ فی کس بطور انعام دیئے گئے۔ بخاری شریف میں ہے:۔

خیارکم فی الجاھلیة خیارکم فی الاسلام اذا فقہوا۔

جو زمانہ جاہلیت میں معزز تھے، وہ اسلام میں بھی ویسے ہی معزز رہیں گے جب وہ اپنے دین سے واقفیت (میں کمال) پیدا کر لیں۔

اور یہ حدیث بھی کہ زمانہ کفر کی بھی نیکیاں اسلام لانے کے بعد نامہ اعمال کی نیکیوں میں شامل اور اضافہ کر لی جاتی ہیں۔

حاتم طائی کا بیٹا مدینہ آیا تو آنحضرتؐ نے اس کے لئے مسند بچھائی۔ ایسی بیسیوں مثالیں ملیں گی۔

سفیروں کو انعام و اکرام دینے میں جناب رسالت کو یہاں تک اہتمام تھا کہ مرض الموت کی وصیتوں میں سے ایک اسی کے متعلق تھی کہ آپ کا طرز عمل مسلمان آئندہ بھی جاری رکھیں۔

یہ ظاہر ہے کہ چادر دیکھ کر پاؤں پھیلائے جا سکتے ہیں، کبھی انعام فوراً دے دیا جا سکتا تو کبھی وعدے ہی پر اکتفا کرنی ہوتی۔ مثلاً ابو ثعلبہ خشنی نے آنحضرتؐ سے درخواست کی کہ اگر روی

(بیزنطینی) علاقہ فتح ہوتو مجھے فلاں علاقہ جاگیر میں دیا جائے۔آنحضرتؐ نے اُسے منظور فرمایا۔
(کتاب الاموال لابی عبیدہ صفحہ 679)

اسی طرح ایک شیبانی شخص نے آکر اسلام قبول کیا اور کہا: ''یارسول اللہؐ! اگر شہر حیرہ فتح ہوتو مجھے وہاں کے امیر بقیلہ کی بیٹی مال غنیمت سے بطور انعام عطا فرمایئے۔آنحضرتؐ کے وعدے کی خلافت راشدہ میں حضرت خالد بن ولیدؓ نے تعمیل کی عزت حاصل کی۔(ایضاً ف 487) ایسا ہی ایک معاملہ تمیم داریؓ کا ہے۔کہتے ہیں ہجرت نبویؐ سے بھی قبل یہ آکر مسلمان ہوئے۔اور وعدہ لیا کہ اگر فلسطین فتح ہوتو خبرون،عینون اور بیت ابراہیم نامی گاؤں ان کو جاگیر میں دیئے جائیں۔بہ ترک تفصیل مختصر یہ کہ اس کی تعمیل کا موقع خلافت فاروقی میں مل سکا۔(الوثاق السیاسیہ دستاویزات متعلقہ نیز مقریزی کی الضور الساری لمعرفۃ خبر تمیم الداری،مخطوطہ پاریس ولائدن)۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کو بھی شام کی فتح پر سلیل نامی اراضی کے دینے کا ارادہ فرمایا تھا۔
(ابن سعد 3/1 صفحہ 89)

تالیف قلبی کے ایک اور پہلو سے بحث کر کے آج کی صحبت ختم کی جاتی ہے۔شہر طائف کا وفد مدینہ آتا ہے،اور مسلمان ہونے پر آمادہ ہے۔شرط یہ پیش کرتا ہے کہ انہیں نماز سے مستثنیٰ کیا جائے۔اُن کے لئے زنا حرام نہ رہے،ان کے شہر کو بھی مکے کی طرح ایک حرم قرار دیا جائے ،جہاں کے درخت کاٹنا اور جانوروں کا شکار کرنا ممنوع ہو۔آنحضرتؐ نے جو عام جبری فوجی خدمت نافذ فرمائی تھی،اور جہاد کو فرض قرار دیا تھا اس سے ان کو مستثنیٰ کیا جائے،اور زکات سے بھی یہ بری رہیں۔آنحضرتؐ نے نماز اور زنا کی شرطوں کو رد فرمادیا۔اور آخری تین شرطیں منظور کرلیں۔اور یہ رعایت بھی کہ طائف کو بت خانہ توڑنے کے لئے اہل طائف کو مجبور نہ کیا جائے بلکہ مدینے سے سرکاری افسر جا کر اُسے منہدم کرائیں۔۔۔۔(اور جب وفد چلا گیا تو حیرت زدہ صحابہؓ سے آنحضرتؐ نے فرمایا کہ جہاد اور زکات کی فرضیت منسوخ نہیں ہوئی ہے۔یہ رعایت ان کو دی گئی ہے،لیکن جب اسلام ان کے دل میں گھر کر لے گا تو وہ خود بخود جہاد بھی کریں اور

زکات بھی دیں گے۔اور ہوا بھی بعد کو یہی)۔۔۔۔اس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ تالیفِ قلبی کس حد تک کی جا سکتی ہے۔اور کن باتوں میں اسے مادی فائدوں کے باوجود نہیں رکھا جا سکتا؟

غرض "والمؤلفة قلوبهم" اور "الانفال لله والرسول" کے ذریعے قرآن مجید نے عملی سیاسیات کی جو نہایت اہم اور دور رس تعلیم دی ہے، اور حکمراں کو صوابدید کا جو وسیع حق دیا، اس کی عہدِ نبوی کی نظیروں سے کافی تشریح اور توضیح ہوتی ہے۔زندہ قوموں میں اجتماعی مفاد کے لئے تالیفِ قلبی خصوصی وزارت قائم ہوتی ہے تو مردہ قوموں میں رشتہ داری اور انفرادی مفاد کے لئے مملکت کا نقصان روا رکھا جاتا ہے۔ایک جیتتا اور نفع حاصل کرتا ہے اور دوسرا کھوتا اور نقصان اُٹھاتا ہے۔وما توفیقنا الا باللہ۔

(رسالہ نظامیہ حیدرآباد دکن ربیع الاول 1357ھ)

دلیل آخرت

(مولانا وحید الدین خاں)

مذہب جن حقیقتوں کو ماننے کی ہمیں دعوت دیتا ہے، ان میں سے ایک اہم ترین حقیقت۔۔ آخرت کا تصور ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ موجودہ دنیا کے بعد ایک اور دنیا ہے جہاں ہم کو ہمیشہ رہنا ہے، موجودہ دنیا انسان کی امتحان گاہ ہے، یہاں ایک خاص عرصہ کے لئے انسان کو رکھا گیا ہے، اس کے بعد ایک وقت ایسا آنے والا ہے، جب اس کا مالک اسے توڑ کر دوسری دنیا دوسرے ڈھنگ پر بنائے گا وہاں تمام انسان دوبارہ زندہ کیے جائیں گے، ہر ایک نے موجودہ دنیا میں جو اچھے یا برے عمل کئے ہیں، وہ تمام وہاں خدا کی عدالت میں پیش ہوں گے، اور ہر ایک کو اس کے عمل کے مطابق انعام یا سزا دی جائے گی۔

یہ نظریہ صحیح ہے یا غلط، اس کو جانچنے کے لئے ہم اس پر چند پہلوؤں سے غور کریں گے۔

امکان

پہلی بات یہ ہے کائنات کے موجودہ نظام میں کیا اس طرح کی کسی آخرت کا واقع ہونا ممکن نظر آتا ہے کیا یہاں کچھ ایسے واقعات اور اشارے پائے جاتے ہیں، جو اس دعوے کی تصدیق کر رہے ہوں۔

یہ نظریہ سب سے پہلے یہ چاہتا ہے کہ انسان اور کائنات اپنی موجودہ شکل میں ابدی نہ ہوں، اور یہ دونوں چیزیں ہماری اب تک کی معلومات کے مطابق بالکل یقینی ہیں، ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ یہاں انسان کے لئے بھی موت ہے اور کائنات کے لئے بھی موت، دونوں میں سے کوئی بھی موت کے خطرے سے خالی نہیں جو لوگ دوسری دنیا کو نہیں مانتے وہ قدرتی طور پر یہ چاہتے ہیں کہ اسی دنیا کو اپنی ابدی خوشیوں کی دنیا بنائیں، انہوں نے اس بات کی تحقیق کی کہ موت کیوں آتی ہے تاکہ اس کے اسباب کو روک کر زندگی کو جاوداں بنایا جا سکے، مگر انہیں اس سلسلے میں قطعی ناکامی ہوئی۔۔۔۔ ہر مطالعہ نے بالآخر یہی بتایا کہ موت یقینی ہے، اس سے چھٹکارا نہیں۔

''موت کیوں آتی ہے''۔۔۔اس کے تقریباً دوسو جوابات دیے گئے ہیں جسم ناکارہ ہو جاتا ہے، اجزائے ترکیبی صرف ہو چکے ہیں، رگیں پتھرا جاتی ہیں، متحرک البومن کی جگہ کم متحرک البومن آجاتے ہیں، مربوط کرنے والے نسیج بیکار ہو جاتے ہیں، جسم میں آنتوں کے بیکٹیریا کا زہر دوڑ جاتا ہے۔۔۔وغیرہ وغیرہ

جسم کے ناکارہ ہونے کی بات بظاہر درست معلوم ہوتی ہے، کیونکہ مشینیں، جوتے، کپڑے، سبھی ایک خاص مدت کے بعد ناکارہ ہو جاتے ہیں، اس لئے ہوسکتا ہے کہ پوستین کی طرح ہمارا جسم بھی، جلد یا بدیر پرانا ہو کر ختم ہو جاتا ہو، مگر سائنس اس کی تائید نہیں کرتی، سائنسی تشریح کے مطابق جسم انسانی نہ پوستین کی طرح ہوتا ہے نہ مشین سے ملتا جلتا ہے، اور نہ چٹان سے مشابہ ہے، اگر اسے تشبیہ دی جاسکتی ہے تو دریا سے جو ہزار سال پہلے بہا کرتا تھا، اور آج بھی اسی طرح بہہ رہا ہے، اور کون کہہ سکتا ہے کہ دریا پرانا ہوتا ہے یا ناکارہ ہو جاتا ہے، اسی بنیاد پر کیمسٹری کے نوبل انعام یافتہ ڈاکٹر لنس پالنگ نے کہا ہے کہ نظریاتی طور پر انسان بڑی حد تک لافانی ہے، اس کے جسم کے خلیے ایسی مشین ہیں جو خود بخود اپنی خرابی دور کر لیتے ہیں لیکن اس کے باوجود انسان بوڑھا ہوتا ہے اور مر جاتا ہے اس کے اسباب ابھی تک راز بنے ہوئے ہیں۔

ہماری زندگی کی مسلسل تجدید ہوتی رہتی ہے، ہمارے خلیوں میں البومن کے سالمے بنتے اور تلف ہوتے اور پھر بنتے رہتے ہیں، خلیے بھی (سوائے اعصابی خلیوں کے) برابر تلف ہوتے اور ان کی جگہ نئے بنتے رہتے ہیں، اندازہ لگایا گیا ہے، کہ کوئی چار مہینے کے عرصے میں انسان کا خون بالکل ہی نیا ہو جاتا ہے اور چند سال کے عرصے میں انسانی جسم کے تمام ایٹم پوری طرح بدل جاتے ہیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کی نوعیت ایک ڈھانچے کی نہیں بلکہ دریا کی سی ہے، یعنی وہ ایک عمل ہے، ایسی حالت میں جسم کے پرانے اور ناکارہ ہونے کے تمام نظریے بے بنیاد ہو جاتے ہیں، وہ تمام چیزیں جو زندگی کے ابتدائی برسوں میں خراب ہو گئی تھیں، زہر آلود اور بیکار ہو چکی تھیں، وہ جسم سے کب کی خارج ہو چکیں، پھر ان کو موت کا سبب قرار دینا کیا معنی۔۔۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ موت کا سبب آنتوں اور رگوں اور دل میں نہیں بلکہ اس کا سبب کہیں اور ہے۔

ایک توجیہہ یہ ہے کہ اعصابی خلیے موت کا سبب ہیں، کیونکہ اعصابی خلیے زندگی بھر وہی رہتے ہیں یہ کبھی نہیں بدلتے، چنانچہ انسان کے اندر اعصابی خلیے سال بہ سال کم ہوتے جاتے ہیں، اور مجموعی طور پر اعصابی نظام کمزور ہوجاتا ہے، اگر یہ توجیہہ صحیح ہے، اور اعصابی نظام ہی نظام جسمانی کا کمزور حصہ ہے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ نظام جسمانی سب سے زیادہ دنوں تک زندہ رہنا چاہئے، جن میں اعصابی نظام ہوتا ہی نہیں۔

مگر مشاہدہ اس کی تائید نہیں کرتا، درخت میں اعصابی نظام نہیں ہوتا اور وہ سب سے زیادہ دنوں تک زندہ رہتا ہے، مگر گیہوں میں بھی اعصاب نہیں ہوتے مگر وہ صرف سال بھر زندہ رہتا ہے اور اسی طرح ایسا کیڑے میں بھی اعصاب نہیں ہوتے لیکن وہ صرف آدھ گھنٹہ زندہ رہتا ہے، اسی طرح اس توجیہہ کا مطلب یہ ہے کہ اعلیٰ نسل کے حیوانات کی عمر، جن کا اعصابی نظام مکمل ترین ہوتا ہے، سب سے زیادہ ہونی چاہئے، مگر ایسا نہیں ہے، مگر مچھ، کچھوا اور پائک مچھلی سب سے لمبی عمر پاتے ہیں۔

اس طرح موت کو غیر یقینی بنانے کے لئے اس کے اسباب کی جتنی چھان بین کی گئی ہے، وہ سب ناکامی پر ختم ہوئی ہے، اور یہ امکان اب بھی بدستور باقی ہے کہ سارے انسانوں کو ایک مقررہ مدت پر مرنا ہے، اور ایسا کوئی امکان اب تک ثابت نہ ہوسکا کہ موت نہیں آئے گی، ڈاکٹر الکسس کیرل نے اسی مسئلہ پر زمان داخلی (INWARD TIME) کے عنوان سے لمبی بحث کی ہے، اور اس سلسلے کی کوششوں کی ناکامی کر ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

انسان بقا کی تلاش اور جستجو سے کبھی نہیں اکتائے گا، مگر اس کو کبھی یہ چیز حاصل نہیں ہوسکتی، کیونکہ وہ جسمانی ساخت کے چند قوانین کا پابند ہے، وہ عضویاتی زمان (PHYSIOLOGICAL TIME) کو روکنے اور غالباً ایک حد تک اس کو پیچھے ہٹانے

میں کامیاب ہوسکتا ہے، لیکن وہ موت پر کبھی فتح نہیں پا سکتا؟

(MAN THE UNKNOWN,P.175.)

اسی طرح نظام کائنات کی موجودہ شکل کا درہم برہم ہونا بھی ایک ایسی چیز ہے، جو بالکل واقعاتی طور پر سمجھ میں آتی ہے، اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ کائنات میں ہم جن چھوٹی چھوٹی قیامتوں سے واقف ہیں، وہی آئندہ کسی وقت زیادہ بڑے پیمانے پر ظاہر ہونے والی ہے، یہ صرف موجودہ مقامی قیامتوں کے عالمی پیمانے پر واقع ہونے کی پیشین گوئی ہے۔

سب سے پہلا تجربہ جو ہم کو قیامت کے امکان سے باخبر کرتا ہے۔ وہ زلزلہ ہے، زمین کا اندرونی حصہ نہایت گرم سیال کی شکل میں ہے جس کا مشاہدہ آتش فشاں پہاڑوں سے نکلنے والے لاوا کی شکل میں ہوتا ہے، یہ مادہ مختلف شکلوں میں زمین کی سطح کو متاثر کرتا ہے جس کی وجہ سے بعض اوقات زمین کے اوپر زبردست گڑگڑاہٹ کی آواز محسوس ہوتی ہے، اور کش مکش کی وجہ سے جھٹکے پیدا ہوتے ہیں ۔۔۔ اسی کا نام زلزلہ ہے، یہ زلزلہ آج بھی انسان کے لئے سب سے زیادہ خوفناک لفظ ہے، یہ انسان کے اوپر قدرت کا ایک حملہ ہے جس میں فیصلے کا اختیار تمام تر دوسرے فریق کو ہوتا ہے، زلزلہ کے مقابلے میں انسان بالکل بے بس ہے، یہ زلزلے ہمیں یاد دلاتے ہیں کہ ہم ایک سرخ پگھلے ہوئے نہایت گرم مادے کے اوپر آباد ہیں جس سے صرف 50 کلومیٹر کی ایک پتلی سی چٹانی تہہ ہم کو الگ کرتی ہے، جو زمین کے مقابلے میں ویسی ہی ہے جیسے سیب کے اوپر اس کا باریک چھلکا، ایک جغرافیہ داں کے الفاظ ہیں ہمارے آباد شہروں اور نیلے سمندروں کے نیچے ایک قدرتی جہنم (PHYSICAL HELL) دہک رہا ہے، یا یوں کہنا چاہئے کہ ہم ایک عظیم ڈائنامیٹ کے اوپر کھڑے ہیں، جو کسی بھی وقت پھٹ کر سارے نظام ارضی کو درہم برہم کرسکتا ہے۔

GEORGE GAMOW, BIOGRAPHY OF THE)
(EARTH, P. 82.

یہ زلزلے دنیا کے تقریباً ہر حصے میں اور ہر روز آتے ہیں لیکن جغرافیائی اعتبار سے وہ زیادہ تعداد میں وہاں محسوس ہوتے ہیں، جہاں آتش فشاں پہاڑ ہیں، سب سے قدیم تباہ کن زلزلہ جس سے تاریخ واقف ہے، وہ چین کے صوبہ شنسی (SHINSI) کا زلزلہ ہے، جو 1556ء میں آیا تھا، اس زلزلے میں آٹھ لاکھ سے زیادہ اشخاص ہلاک ہو گئے، اسی طرح یکم نومبر 1755ء کو پرتگال میں زلزلہ آیا جس نے لزبن (LISBON) کا پورا شہر تباہ کر دیا، اس زلزلے میں چھ منٹ کے اندر تیس ہزار آدمی ہلاک ہو گئے، تمام عمارتیں مسمار ہو گئیں، اندازہ کیا گیا ہے کہ اس زلزلے میں یورپ کے رقبہ کا چوگنا حصہ ہل گیا تھا، اسی نوعیت کا ایک شدید زلزلہ 1897ء میں آسام میں آیا تھا، جو دنیا کے پانچ انتہائی بڑے زلزلوں میں شمار ہوتا ہے، اس سے شمالی آسام میں ہولناک تباہی آئی تھی، اس زلزلے نے دریائے برہم پتر کا رخ بدل دیا اور ایورسٹ کی چوٹی ابھر کر سو فٹ اوپر چلی گئی۔

زلزلہ دراصل چھوٹے پیمانے کی قیامت ہے، جب دہشت انگیز گڑگڑاہٹ کے ساتھ زمین پھٹ جاتی ہے، جب پختہ مکانات تاش کے پتوں کے گھروندے کی طرح گرنے لگتے ہیں، جب زمین کا اوپری حصہ دھنس جاتا ہے، اور اندرونی حصہ اوپر آجاتا ہے، جب آباد ترین شہر چند لمحوں میں وحشت ناک کھنڈر کی صورت اختیار کر لیتے ہیں، جب انسان کی لاشیں اس طرح ڈھیر ہو جاتی ہیں، جیسے مری ہوئی مچھلیاں زمین کے اوپر پڑی ہوں ۔۔۔۔ یہ زلزلے کا وقت ہوتا ہے، اس وقت انسان محسوس کرتا ہے کہ وہ قدرت کے مقابلے میں کس قدر بے بس ہے، یہ زلزلے بالکل اچانک آتے ہیں، درحقیقت زلزلے کا المیہ اس امر میں پوشیدہ ہے کہ کوئی بھی شخص یہ پیشین گوئی نہیں کر سکتا کہ زلزلہ کب اور کہاں آئے گا، یہ زلزلے گویا اچانک آنے والی قیامت کی پیشگی اطلاع ہیں، یہ ہمیں بتاتے ہیں کہ زمین کا مالک کس طرح زمین کے موجودہ نظام کو توڑنے پر پوری طرح قادر ہے۔

یہی حال بیرونی کائنات کا ہے، کائنات نام ہے، ایک ایسے لامحدود خلا کا جس میں بے انتہا

بڑے بڑے آگ کے الاؤ (ستارے) بے شمار تعداد میں اندھادھند گردش کررہے ہیں، جیسے بے شمار لٹو کسی فرش پر ہماری تمام سواریوں سے زیادہ تیزی کے ساتھ مسلسل ناچ رہے ہوں، صفحہ 79)

یہ گردش کسی بھی وقت زبردست ٹکراؤ کی صورت اختیار کرسکتی ہے، اس وقت کائنات کی حالت بہت بڑے پیمانے پر ایسی ہی ہوگی جیسے ہزاروں بمبار ہوائی جہاز بموں سے لدے ہوئے فضا میں اڑ رہے ہوں اور یکا یک سب کے سب باہم ٹکرا جائیں، اجرام سماوی کا اس قسم کا ٹکراؤ کسی بھی درجہ میں حیرت انگیز نہیں ہے بلکہ یہ بات حیرت انگیز ہے کہ وہ آخر ٹکرا کیوں نہیں جاتے، علم الافلاک کا مطالعہ بھی بتاتا ہے کہ ستاروں کا باہم ٹکرا جانا ممکن ہے، چنانچہ شمسی نظام کے وجود میں آنے کی ایک توجیہہ اسی قسم کے ٹکراؤ پر کی گئی ہے، اس ٹکراؤ کو اگر ہم بڑے پیمانے پر قیاس کرسکیں تو ہم نہایت آسانی سے زیر بحث امکان کو سمجھ سکتے ہیں، کیونکہ دراصل اسی واقعہ کا دوسرا نام "قیامت" ہے، نظریہ آخرت کا یہ دعویٰ کہ کائنات کا موجودہ نظام ایک روز درہم برہم ہوجائے گا، اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ جو واقعہ کائنات کے اندر ابتدائی شکل میں موجود ہے، وہی ایک روز انتہائی شکل میں پیش آنے والا ہے۔۔۔ قیامت کا آنا ہمارے لئے ایک معلوم حقیقت ہے۔۔ فرق صرف یہ ہے کہ آج ہم اسے امکان کی حد تک جانتے ہیں۔۔۔ اور کل اسے واقعہ کی صورت میں دیکھیں گے۔

آخرت کے امکان کے سلسلے میں دوسرا مسئلہ زندگی بعد موت کا مسئلہ ہے، "کیا مرنے کے بعد بھی کوئی زندگی ہے" موجودہ ذہن اپنے آپ سے سوال کرتا ہے، اور پھر خود ہی اس کا جواب دیتا ہے۔۔۔ "نہیں مرنے کے بعد کوئی زندگی نہیں، کیونکہ ہم جس زندگی سے واقف ہیں وہ مادی عناصر کے بعد کوئی زندگی بھی نہیں ہوسکتی"۔

ٹی، آر، مائلز (T.R. MILLS) بعثت بعد الموت کو محض ایک تمثیلی حقیقت قرار دیتا ہے، اور اس کو ایک لفظی حقیقت (LITERA TRUTH) کے طور پر ماننے سے انکار کرتا ہے۔

''میرے نزدیک'' وہ کہتا ہے ''یہ ایک مضبوط مقدمہ ہے کہ مرنے کے بعد آدمی زندہ رہتا ہے، یہ بالکل لفظی طور پر ایک حقیقت ہوسکتی ہے'' اور اس قابل ہے کہ تجربے سے اس کا غلط یا صحیح ہونا معلوم کیا جاسکے، مشکل صرف یہ ہے کہ جب تک ہم کو موت نہ آئے، اس کا قطعی جواب معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے، مگر یہ قیاس کرنا ممکن ہے۔ اب چونکہ قیاس اس کے خلاف ہے، اس لئے اس کے نزدیک یہ لفظی حقیقت نہیں، وہ قیاس یہ ہے:۔

''علم الاعصاب (NEUROLOGY) کے مطابق خارجی دنیا اور اس سے تعلقات کا علم صرف اس وقت ممکن ہے، جب کہ انسانی دماغ معمول کے مطابق کام کررہا ہو اور موت کے بعد جبکہ دماغ کی تنظیم منتشر ہو جاتی ہے، اس قسم کا ادراک (AWARENESS) ناممکن ہے مگر اس سے زیادہ قوی قیاسات دوسرے موجود ہیں، جو یہ ظاہر کرتے ہیں کہ جسم کے ذرات مادی کا انتشار زندگی کو ختم نہیں کرتا، زندگی ایک الگ اور مستقل بالذات چیز ہے، جو ذرات کی تبدیلی کے باوجود باقی رہتی ہے۔

ہم جانتے ہیں کہ انسان کا جسم بعض خاص قسم کے اجزا سے مل کر بنا ہے، جس کی مجموعی اکائی کو خلیہ (CELL) کہتے ہیں، یہ خلیے نہایت پیچیدہ ساخت کے چھوٹے چھوٹے ریزے ہیں، جن کی تعداد ایک متوسط قد کے انسان میں تقریباً 26 پدم ہوتی ہے، یہ گویا بے شمار چھوٹی چھوٹی اینٹیں ہیں جن کے ذریعہ ہمارے جسم کی عمارت تعمیر ہوئی ہے، فرق یہ ہے کہ عمارت کی اینٹیں پوری زندگی بھر وہی کی وہی رہتی ہیں، جو شروع میں اس کے اندر لگائی گئی تھیں، مگر جسم کی اینٹیں ہر وقت بدلتی رہتی ہیں، جس طرح ہر چلنے والی مشین کے اندر گھساؤ (DEPRECIATION) کا عمل ہوتا ہے، اسی طرح ہماری جسمانی مشین بھی گھستی ہے، اور اس کی ''اینٹیں'' مسلسل ٹوٹ ٹوٹ کر کم ہوتی رہتی ہیں، یہ کمی غذا سے پوری ہوتی ہے، غذا ہضم ہوکر ہمارے جسم کے لئے وہ تمام اینٹیں مہیا کرتی ہے، جو ٹوٹ پھوٹ کی وجہ سے ہر روز ہمارے جسم کو درکار ہوتی ہیں گویا جسم نام ہے خلیوں کے ایک ایسے مرکب کا جو ہر آن اپنے آپ کو بدلتا رہتا ہو، اس کی مثال بہتے ہوئے دریا

کے ایک گھاٹ کی ہے جو ہر وقت پانی سے بھرا رہتا ہے مگر ہر وقت وہی پانی نہیں ہوتا جو پہلے تھا بلکہ ہر آن وہ اپنے پانی کو بدل دیتا ہے، گھاٹ وہی ہوتا ہے، مگر پانی وہی نہیں ہوتا۔

اس طرح ہر آن ہمارے جسم میں ایک تبدیلی ہوتی رہتی ہے، یہاں تک کہ ایک وقت آتا ہے جب جسم کی پچھلی تمام اینٹیں ٹوٹ کر نکل جاتی ہیں، اور ان کی جگہ مکمل طور پر نئی اینٹیں لے لیتی ہیں، بچے کے جسم میں یہ عمل جلد جلد ہوتا ہے، اور عمر کے بڑھنے سے اس کی رفتار سست ہوتی رہتی ہے، اگر پوری عمر کا اوسط لگایا جائے تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ ہر دس سال میں جسم کے اندر یہ تبدیلی واقع ہوتی ہے، ظاہری جسم کے خاتمے کا یہ عمل برابر ہوتا رہتا ہے، مگر اندر کا انسان اسی طرح اپنی اصل حالت میں موجود رہتا ہے، اس کا علم، اس کا حافظہ اس کی تمنائیں، اس کی عادتیں اس کے تمام خیالات بدستور باقی رہتے ہیں، وہ اپنی عمر کے ہر مرحلے میں اپنے آپ کو وہی سابق "انسان" محسوس کرتا ہے، جو پہلے تھا، حالانکہ اس کی آنکھ، کان، ناک، ہاتھ، پاؤں غرض ناخن سے بال تک ہر ہر چیز بدل چکی ہوتی ہے۔

اب اگر جسم کے خاتمہ کے ساتھ اس جسم کا انسان بھی مر جاتا ہو تو خلیوں کی تبدیلی سے اسے بھی متاثر ہونا چاہئے، مگر ہم جانتے ہیں کہ ایسا نہیں ہوتا، یہ واقعہ ثابت کرتا ہے کہ انسان یا انسانی زندگی جسم سے الگ کوئی چیز ہے جو جسم کی تبدیلی اور موت کے باوجود اپنا وجود باقی رکھتی ہے، وہ ایک گھاٹ ہے جس کی گہرائی میں اجسام یا دوسرے الفاظ میں خلیوں کی ایک مسلسل آمد ورفت جاری ہے، چنانچہ ایک سائنس داں نے حیات یا انسانی ہستی کو ایک ایسی مستقل بالذات چیز قرار دیا ہے، جو مسلسل تغیرات کے اندر غیر متغیر حالت میں اپنا وجود باقی رکھتی ہے۔۔۔۔اس کے الفاظ ہیں:۔

" PERSONALITY IS CHANGELESSNES IN CHANGE"

اگر موت محض جسم کے خاتمے کا نام ہو تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ ایسے ہر عمل کی تکمیل کے بعد گویا

انسان ایک بار مر گیا، اب اگر ہم اس کو دیکھتے ہیں تو یہ دراصل اس کی زندگی ہے، جو اس نے مر کر حاصل کی ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ پچاس سال کی عمر کا ایک زندہ شخص جس کو ہم اپنی آنکھوں سے چلتا پھرتا دیکھتے ہیں، وہ اپنی اس مختصری زندگی میں کم از کم پانچ بار مکمل طور پر مر چکا ہے، پانچ بار کی جسمانی موت سے اگر ایک انسان نہیں مرا تو چھٹی بار کی موت کے بارے میں آخر کیوں یقین کر لیا گیا ہے کہ اس کے بعد وہ لازماً مر جائے گا، اس کے بعد اس کے لئے زندگی کی کوئی صورت نہیں۔

بعض لوگ اس دلیل کو تسلیم نہیں کریں گے وہ کہیں گے کہ وہ ذہن یا اندرونی وجود جس کو تم انسان کہتے ہو، وہ دراصل کوئی علیحدہ چیز نہیں ہے بلکہ خارجی دنیا کے ساتھ جسم کے تعلق سے پیدا ہوا ہے، تمام جذبات و خیالات مادی عمل کے دوران میں اسی طرح پیدا ہوتے ہیں جس طرح دھات کے دو ٹکڑوں کی رگڑ سے حرارت پیدا ہوتی ہے، جدید فلسفہ روح کے مستقل وجود کا انتہائی مخالف ہے، جیمز کہتا ہے، کہ شعور ایک ہستی (ENTITY) ہے، ہمارے زمانے کے فلسفیوں کی بہت بڑی تعداد نے اصرار کیا ہے کہ شعور اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ وہ خارج سے پیدا ہونے والے ہیجان کا عصبی جواب (NERVOUS RESPONSE) ہے۔ اس تصور کے مطابق موت یعنی جسمانی نظام کے منتشر ہونے کے بعد انسان کی موجودگی کا کوئی سوال نہیں، کیونکہ وہ مرکز اعصاب ہی اس کے بعد باقی نہیں رہا، جو خارجی دنیا کے تعامل سے زندگی کا جواب ظاہر کرے نتیجہ یہ نکلا کہ زندگی بعد موت کا تصور بالکل غیر عقلی تصور ہے۔۔۔اس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔

میں کہوں گا کہ انسان کی حقیقت اگر یہی ہے تو یقیناً ہمارے لئے ممکن ہونا چاہئے کہ ہم ایک زندہ اور باشعور انسان کو پیدا کر سکیں، آج ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ انسان کا جسم کن عناصر سے مل کر بنتا ہے، یہ تمام عناصر کثیر مقدار بہت کثیر مقدار میں زمین کے اندر اور اس کی فضا میں قابل حصول حالت میں موجود ہیں، ہم نے جسم کے اندرونی نظام کو انتہائی باریک بینی کے ساتھ معلوم

کرلیا ہے، آج ہم اچھی طرح جانتے ہیں، کہ انسانی جسم کا ڈھانچہ اور اس کے رگ و ریشے کس طرح بنائے گئے ہیں، پھر ہمارے پاس ایسے بے شمار ماہر آرٹسٹ موجود ہیں، جو کمال درجہ مطابقت کے ساتھ انسان کی مانند ایک جسم بنا کر کھڑا کر دیں، مخالفین روح کو اگر اپنے نظریے پر یقین ہے تو وہ ایسا کیوں نہیں کرتے کہ بہت سے انسانی جسم تیار کر کے زمین کے مختلف حصوں میں کھڑا کر دیں، اور اس وقت کا انتظار کریں جب خارجی دنیا کے اثرات پڑنے سے یہ ڈھانچے چلنے اور بولنے لگیں گے۔

یہ زندگی کے باقی رہنے کے امکان کی بحث تھی، اب اس مقصد کے اعتبار سے غور کیجئے جس کے لئے مذہب دوسری زندگی کے اوپر عقیدہ رکھتا ہے، ہمارے تصور کے مطابق زندگی کا بقائشے کی "آمد و رفت" کا نام نہیں ہے جو شیشہ ساعت (SAND GLASS) کی طرح بس خالی اور پر ہوتی رہے، اس سے آگے اس کا اور کوئی مقصد نہ ہو۔۔۔ بلکہ دوسری زندگی کا ایک عظیم مقصد ہے اور یہ وہ کہ موجودہ دنیا کی اچھائیوں اور برائیوں کا بدلہ دیا جائے۔

عقیدہ آخرت کا یہ جزو بھی اس وقت بالکل ممکن نظر آنے لگتا ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ کائنات میں حیرت انگیز طور پر ہر شخص کا نامہ اعمال رات دن ایک لحہ کے وقفہ کے بغیر ضبط (RECORD) کیا جارہا ہے آدمی تین شکلوں میں اپنی ہستی کو ظاہر کرتا ہے۔۔۔ نیت قول اور عمل، یہ تینوں چیزیں مکمل طور پر محفوظ کی جارہی ہیں، ہمارا ہر خیال، ہماری زبان سے نکلا ہوا ہر لفظ اور ہماری تمام کاروائیاں کائنات کے پردہ پر اس طرح نقش ہو رہی ہیں کہ کسی بھی وقت ان کو نہایت صحت کے ساتھ دہرایا جاسکے، اور یہ معلوم ہو سکے کہ دنیا کی زندگی میں کس نے کیا کہا، کس کی زندگی شر کی زندگی تھی، اور کس کی زندگی خیر کی زندگی۔

جو خیالات ہمارے دل میں گزرتے ہیں، ہم بہت جلد انہیں بھول جاتے ہیں، اس سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو گئے، مگر جب ہم مدتوں کی ایک بھولی ہوئی بات کو خواب میں دیکھتے ہیں یا ذہنی اختلال کے بعد آدمی ایسی باتیں بولنے لگتا ہے جو اس کے فراموش شدہ ماضی سے متعلق ہیں، تو یہ واقعہ ظاہر کرتا ہے کہ آدمی کا حافظہ اتنا ہی نہیں ہے، جتنا شعوری طور وہ محسوس کرتا ہے، حافظہ کے کچھ خانے ایسے بھی ہیں، جو بظاہر شعور کی گرفت میں نہیں رہتے، مگر وہ موجود ہوتے ہیں۔

یہ اور اس طرح کے دوسرے تجربوں سے ثابت ہوا ہے کہ ہمارے تمام خیالات مستقل طور پر اپنی پوری شکل میں محفوظ رہتے ہیں، حتیٰ کہ ہم چاہیں بھی تو انہیں محو نہیں کر سکتے، یہ تحقیقات بتاتی ہیں کہ انسانی شخصیت صرف وہی نہیں ہے، جسے ہم شعور کہتے ہیں، بلکہ اس کے برعکس نفس انسانی کا ایک حصہ ایسا بھی ہے، جو ہمارے شعور کی سطح کے نیچے موجود رہتا ہے، یہ حصہ جسے فرائڈ تحت شعور (SUB-CONSCIOUS) یا لاشعور (UNCONSCIOUS) کا نام دیتا ہے، یہ ہماری شخصیت کا بہت بڑا حصہ ہے، نفس انسانی کی مثال سمندر میں تیرتے ہوئے تودۂ برف (ICEBERG) کی سی ہے جس کا صرف نواں حصہ پانی کے اوپر دکھائی دیتا ہے، اور بقیہ آٹھ حصے سطح سمندر کے نیچے رہتے ہیں یہی تحت شعور ہے جو ہمارے تمام خیالات اور ہماری نیتوں کو محفوظ رکھتا ہے، فرائڈ اپنے اکتیسویں لیکچر میں کہتا ہے:۔

"منطق کے قوانین بلکہ اضداد کے اصول بھی لاشعور (ID) کے عمل پر حاوی نہیں ہوتے، مخالف خواہشات ایک دوسرے کو زائل کئے بغیر اس میں پہلو بہ پہلو ہمیشہ موجود رہتی ہیں۔۔۔ لاشعور میں کوئی ایسی چیز نہیں جو نفی سے مشابہت رکھتی ہو، اور ہمیں یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ لاشعور کی دنیا میں فلسفیوں کا یہ دعویٰ غلط ہو جاتا ہے کہ ہمارے تمام دماغی افعال وقت اور فاصلہ کے درمیان واقع ہوتے ہیں، لاشعور کے اندر کوئی ایسی چیز نہیں جو وقت کے تصور سے مطابقت رکھتی ہو، لاشعور میں وقت کے گزرنے کا کوئی نشان نہیں اور یہ ایک حیرت انگیز حقیقت ہے جس کے معنی سمجھنے کی طرف ابھی تک فلسفیوں نے پوری توجہ نہیں کی کہ وقت کے گزرنے سے ذہنی عمل میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی ایسے خیالات (CONATIVE IMPULSES) جو کبھی لاشعور سے باہر نہیں آئے بلکہ وہ ذہنی تاثرات بھی جنہیں روک کر لاشعور میں دبا دیا گیا ہو، فی الواقع غیر فانی ہوتے ہیں اور دسیوں سال تک اس طرح محفوظ رہتے ہیں، گویا ابھی کل وجود میں آئے ہیں۔ (جاری)

بانی سلسلہ کی دیگر تصانیف

تعمیر ملت

قرون اولیٰ میں مسلمانوں کی بے مثال ترقی اور موجودہ دور میں زوال وانحطاط کی وجوہات
اسلامی تصوف کیا ہے؟ سلوک طے کرنے کا عملی طریقہ، سلوک کا ماحصل اور سلوک کے ادوار
ایمان محکم کس طرح پیدا ہوتا ہے؟ عالم روحانی کی تشریح، جنت، دوزخ کا محل وقوع
اور ان کے طبقات کی تعداد، انسانی روح کی حقیقت کیا ہے؟ روح کا دنیا میں آنا اور
واپسی کا سفر، اسلامی عبادات، معاملات، اور اخلاق وآداب کے اسرار و رموز اور نفسیاتی
اثرات، امت مسلمہ کے لئے اپنے کھوئے ہوئے مقام کے حصول کیلئے واضح لائحہ عمل۔

چراغ راہ

کتاب ہذا بانی سلسلہ خواجہ عبدالحکیم انصاریؒ کے خطبات پر مشتمل ہے۔ جو آپ نے سالانہ
اجتماعات پر ارشاد فرمائے اسمیں درج ذیل خصوصی مسائل پر روشنی ڈالی گئی۔
سلوک وتصوف میں ذاتی تجربات، مرشد کی تلاش کے دس سالہ دور کا حال۔
زوال امت میں امراء، علماء، صوفیا کا کردار۔ علماء اور صوفیاء کے طریق اصلاح کا فرق۔
تصوف خفتہ اور بیدار کے اثرات اور تصوف کے انسانی زندگی پر اثرات۔
سلسلہ عالیہ توحیدیہ کے قیام سے فقیری کی راہ کیونکر آسان ہوئی۔

طریقت توحیدیہ

یہ کتاب سلسلہ عالیہ توحیدیہ کا آئین ہے۔ اس میں سلسلے کی تنظیم اور عملی سلوک کے طریقے
تفصیل کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں۔ جو لوگ سلسلہ میں شامل ہونا چاہتے ہیں انہیں یہ
کتاب ضرور پڑھنی چاہئے۔ حضرت خواجہ عبدالحکیم انصاریؒ نے تصوف کی تاریخ میں پہلی
مرتبہ فقیری کا مکمل نصاب اس چھوٹی سی کتاب میں قلم بند کر دیا ہے۔ اس میں وہ تمام
اوراد و اذکار اور اعمال واشغال تفصیل کے ساتھ تحریر کر دیئے ہیں جس پر عمل کر کے
کے ایک سالک اللہ تعالیٰ کی محبت، حضوری، لقاء اور معرفت حاصل کر سکتا ہے۔

حقیقت وحدت الوجود

کتاب ہذا وحدت الوجود کے موضوع پر ایک مختصر مگر نہایت مدلل اور اہم دستاویز ہے
خواجہؒ صاحب نے ذاتی مشاہدہ کو عام فہم دلائل کی روشنی میں آسان زبان میں بیان کیا
ابن عربیؒ کے نظریہ وحدت الوجود اور حضرت مجدد الف ثانیؒ کے وحدت شہود میں فرق۔
انسان کی بقا اور ترقی کیلئے مذہب کیوں ناگزیر ہے۔
وہ بنیادی سوال جس نے نظریہ وحدت الوجود کو جنم دیا۔
روحانی سلوک کے دوران تمام بزرگان عظام کو ہو جانے والی غلط فہمیاں۔